آتشِ عشق

کنیز نبوی

کنیز نبوی

مکمل ناول

پرندے سندھ کی میٹھی مچھلیوں کو الوداع کہہ کر اپنے دیس سائبیریا کی طرف اڑانیں بھر چکے تھے۔

سید جانب علی شاہ جیلانی' سندھ یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کی ڈگری لے کر لوٹا تھا۔ گاؤں میں اس کی آمد کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بڑے پیمانے پر کھانے کا انتظام تھا۔ گاؤں پہنچتے ہی وہ بھی ان تیاریوں میں مگن ہو گیا۔

جلسہ گاہ کی پنڈال اس نے خود کھڑے ہو کے بنوائی۔ اس میں روشنیوں اور پانی کا انتظام اچھی طرح کروایا۔

گرمیاں تقریباً" آچکی تھیں۔ سو شہر سے برف منگوا کر پانی کی ٹنکیاں ٹھنڈی کروائیں اور لنگر کا انتظام اس بہترین طریقے سے کیا کہ کوئی بھوکا نہ جائے۔ محی الدین' بیٹے کے انتظامی امور دیکھ کر بے حد خوش ہو رہے تھے۔

"جانب علی شاہ! تو تو میرا ایک وارث (بیٹا) ہے۔ میری نس نس رگ رگ سے تیرے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا تیرے من کے چمن کو سدا آباد رکھے۔ تجھے عروج دے۔"
اس نے ادب سے جھک کر باپ کے ہاتھ چومے' پھر اندر

حویلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ابھی اسے نہا کر جلسہ گاہ پہنچنا تھا۔ لوگوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔

وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کا کمرہ صاف ستھرا تھا۔ دادی کے گرد بہت ساری عورتوں کا جمگھٹا دیکھ کر دور سے ہی واپس پلٹ آیا۔ وہ ہمیشہ عورتوں کے جمگھٹے سے گھبراتا تھا۔ اس کی دادی سندھل بیجی کو یہ بات پتہ تھی' وہ ہمیشہ خود اٹھ کر اس سے ملنے کمرے میں آجاتیں۔

اس نے کچھ دیر بیٹھ کر بڑی بیجی کا انتظار کیا پھر نہانے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔

تیار ہو کر نکلنے کے بعد بھی بیجی نہیں آئی تھیں۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر حلیمہ کو آواز دی کہ وہ بیجی کو بلائے۔

"جی سائیں۔ آپ نے بلایا۔" حلیمہ کے بجائے ایک کم عمر بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس کی دودھیاں رنگت' بڑی بڑی خمار آلود آنکھیں۔ گلابی ہونٹ' ستواں کھڑی ناک۔ ایک تو شعلہ سا حسن۔ اوپر سے نظروں کا ارتکاز۔ وہ مرد ہو کر گھبرا گیا۔

"ہاں۔ حلیمہ کو بلایا تھا میں نے کہ۔"

"سائیں۔ اس نے مجھے بھیجا ہے' پوچھنے کو کہ آپ کو کیا کام ہے؟" اس نے ایک دم سے بات کاٹ کر کہا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے اسے تکتا رہا۔

"سائیں! کیا کام ہے؟" اس کے یوں دیکھنے پر وہ گھبرائی۔

"بڑی بیجی کو بلاؤ۔" اس نے چونک کر مدعا بیان کیا۔ وہ سر ہلا کر تیزی سے پلٹی۔

اسے خود پر بے تحاشا غصہ آیا تھا۔ کیوں وہ بے خودی سے اس کو تکتا رہا۔ وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔

وہ اٹھ کر باہر جانے لگا تو رک گیا۔ وہی لڑکی بیجی کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے سہج سہج چلی آرہی۔

بیجی سندھل نے محبت سے اس کے گالوں کو چوما۔ "بابا! تجھے اللہ نیک صالح کرے۔ زمانے کے سرد و گرم سے بچائے۔" بیجی اسے دعائیں دیتی رہیں۔ وہ لڑکی خاموشی سے کھڑی رہی۔

اس نے عقیدت سے بیجی کے ہاتھ چومے اور ان کو بٹھا کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد بیجی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں تو اس نے اپنا دھیان ہاتھ بڑھا کر بیجی کو سہارا دیا۔ وہ دھیرے سے بیجی کے ساتھ پلٹی۔ اس کی بڑی لمبی موٹی کالی بالوں کی چوٹی اس کی پشت پر لہراتی رہی۔

اس لمحے جانب علی شاہ کو لگا اس کا دل اس کی چوٹی کے بلوں میں اٹک گیا ہے۔

کیا ہو رہا تھا اسے' وہ اپنے اس جذبے کو سمجھ کر کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔

اس کی نظروں کی تپش اپنی پشت پر محسوس کر کے یک دم اس نے مڑ کر دیکھا' اس کی خمار آلود سیاہ آنکھیں جانب علی شاہ کی طرف اٹھیں' نظروں کا تصادم ہوا۔

اس کے اندر کی گھبراہٹ' حیرانیاں' غصہ' گریز' سارے جذبے جو محبت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں' اپنی موت آپ مر گئے۔

اس کی آنکھوں کی شدید حیرانگیاں' شناسائی میں ملبوس ہوئیں۔

اور جانب علی شاہ کی نظروں نے اس شناسائی پر اپنا پیارا تبسم وار دیا۔

اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھل گئی۔

جانب علی شاہ سراپا محبت کی روشنی' احساس کے رنگوں اور خوشی کی خوشبوؤں میں نہا گیا۔

وہ غائب دماغی سے پنڈال پہنچا۔ وہاں کیا ہو رہا' سائیں محی الدین نے اسے کتنے لوگوں سے ملوایا' وہ خالی الذہنی کے عالم میں وہاں تقریب میں شریک رہا مگر اس کا دل اس خمار آلود آنکھوں والی لڑکی کی چوٹی کے بلوں پر اٹکھیلیاں کرتا رہا۔ شاید دل سے نکلی سائیں محی الدین کی دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہو چکی تھی۔

"خدا تیرے دل کے چمن کو سدا ہمیشہ آباد رکھے۔"

اور خالی دل آباد ہونے جا رہا تھا۔

محبت کی کیفیت آہستہ آہستہ احساس کے در کھولتی ہے۔ ایک ایک کیفیت الگ الگ وارد ہوتی ہے۔ کبھی درد و فراق کے پہاڑوں پر گھسیٹ کر لہولہان کرتی ہے تو کبھی ہجر کے صحراؤں میں قیس کی طرح دربدر رلاتی ہے۔ کبھی اپنی ذات گم ہو جاتی ہے۔ صرف محبت رہتی ہے' محبت۔

وہ ایسے جہان حیرت میں لا کر چھوڑتی ہے' جہاں پہنچ کر قربت و دوری کا احساس مٹ جاتا ہے۔ ہجر و وصل ہم معنی ہو جاتے ہیں۔

وہ حیران' پریشان خوف زدہ سراسیمہ' بے بس سا کھڑا رہ گیا۔ وہ میدان محبت جہاں بڑے بڑے زور آور ہار جاتے ہیں۔ وہ آنکھیں کھولتا تو بھی اسے دیکھتا' بند کرتا تو بھی وہ بحث سے نمودار ہو جاتی۔ وہ اس کے ذہن کے کونوں میں گڑ کے بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس کے نام' ذات' گھر سے بالکل ناواقف تھا مگر شناسائی کا ایسا احساس تھا کہ اسے لگتا وہ تو اسے اس سے واقفیت حاصل کر چکا ہے۔

وہ تو صدیوں سے جانتا ہے اسے' تب سے جب دونوں کی روحیں عالم ارواح میں ایک دوسرے کی پڑوسی رہی ہوں گی۔ اس کی پہچان تو اس کے اندر رہی کہیں گڑی ہوئی تھی۔ بس ظاہر اب ہوئی تھی۔

کہتے ہیں اول محبت عورت کے دل میں پیدا ہوتی ہے مگر عورت اظہار سے ہچکچاتی ہے۔ سو آگ یک طرفہ نہیں دونوں طرف برابر کی لگی ہوئی تھی۔ جانب علی شاہ کو کوئی محنت و جستجو کی سعی کرنا ہی نہیں پڑی' سوائے چند دن انتظار کے جو کہ اس نے اسی حیرت میں گنوا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ یہ حادثہ ہوا تو کیسے۔ کیونکر ایک اجنبی لڑکی سے بار کا انس پیدا ہو گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

اس دن وہ زمینوں کی دیکھ بھال سے واپس آیا تھا' بڑی بیجی اپنے تخت پر سو رہی تھیں۔ اس نے اپنے کمرے میں آتے آتے ہی حلیمہ کو آواز دے کر کھانا لانے کو کہا۔ شدید بھوک لگی تھی۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

اس نے خوشی و بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں اسے دیکھا' کھانے کی ٹرے لے کر وہ آئی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بھی دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

کبھی کبھی جو کام الفاظ نہیں کر پاتے' وہ ایک تبسم کر دیتا ہے۔

وہ ٹرے رکھتے ہی فوراً' واپس پلٹ گئی۔ شاید اس کے یوں محویت سے مسلسل دیکھتے رہنے سے وہ گھبراہٹ کا شکار ہوئی تھی۔

"ایک منٹ رکو۔" اس نے اس کو پلٹتے دیکھ کر تیزی سے پکارا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے۔

وہ واپس اس کی طرف پلٹی' سوالیہ نظریں اٹھا کر دیکھا اور آنکھوں میں ایک جہان شوق پا کر نظریں جھکالیں۔ اس کی گھنی پلکیں حیا کے بوجھ تلے کانپتی رہیں۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" وہ اسے تکتے ہوئے بمشکل بول سکا۔

"س۔۔۔ سدوری۔"

اس کے گلاب لبوں سے دھیمی سی آواز ابھری۔

"کون ہو؟"

اس کے یوں پوچھنے پر نا سمجھی سے اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

جانب علی شاہ کو احساس ہوا کہ اس نے غلط سوال کیا ہے۔

"میرا مطلب ہے' تمہارے باپ کا کیا نام ہے' کہاں رہتی ہو؟"

"سائیں! شاہ مراد کے رئیس حسین علی کی بیٹی ہوں۔" وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

"رئیس حسین علی۔" اس نے زیر لب نام دہرایا۔

رئیس حسین علی اس کے باپ کے دوست تھے۔ سید ہونے کی وجہ سے وہ سائیں محی الدین کا بے پناہ احترام کرتے تھے۔ وہ اکثر ان کی بے تحاشا عقیدت و محبت دیکھ کر

حیران ہوتا۔ سائیں محی الدین جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے تو رئیس حسین علی ان کی امامت میں نماز پڑھنے ہر ہفتہ گاؤں آتا۔

اس نے اطمینان کی سانس لی' وہ اسے حاصل کر سکتا تھا۔ بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ رئیس حسین علی اس کو بڑی خوشی سے رشتہ دے سکتے تھے۔ آخر کو وہ ان کے عزیز دوست کا اکلوتا بیٹا تھا۔

وہ ان ہی سوچوں میں محو تھا کہ وہ برتن اٹھانے آئی۔ وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر پھر کھل اٹھا مگر وہ حیرت سے ٹرے کو دیکھتی رہی۔

"سائیں کھانا؟"

وہ اس کی بات سمجھ گیا۔ "تمہیں دیکھ کر میری بھوک اڑ گئی ہے۔" وہ بے ساختہ بول اٹھا۔ وہ تھوڑا سا جھل ہو کر گھبرائی۔ پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

محبت شاید ایسی ہی طاقت ور ہے کہ محبوب کو دیکھتے سوچتے بھوک اڑ جاتی ہے۔

جانب علی شاہ کو یہ ادراک عمر میں پہلی بار ہوا تھا۔

✿ ✿ ✿

محبت انسان کو حیلہ ساز بنا دیتی ہے۔ وہ بہانے تلاش کرنے لگتا ہے محبوب کو دیکھنے' اس سے ملنے کا حیلہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ وہ بھی بہانے تلاش کرتی باپ سے کہتی۔ "چچی سندھل سے دعا لینی ہے۔"

"ہاں ہاں چل میرے ساتھ۔" رئیس حسین علی مرشد کی محبت میں شوق سے کہتا۔ وہ بڑی سی اجرک میں لپٹی اجرک کے ایک پلو سے آدھا چہرہ چھپائے باپ کے پیچھے پیدل مرشد کے راستے پر چلنے لگتی۔

رئیس حسین علی' سائیں محی الدین سے اپنی عقیدت و محبت کے کئی واقعات اسے راستے میں سناتا رہتا۔

ایسی باتیں سنتے سنتے وہ بڑی ہوئی تھی اور یہ عقیدت بھری محبت اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنی کم عمری سے سائیں جانب علی کو دیکھتی آئی تھی۔ اسے اپنے باپ کے دوست کا اکلوتا بے نیاز بیٹا اچھا لگتا۔ بوسکی کے کپڑوں میں ملبوس جانب علی شاہ جب سندھی ٹوپی پہنتا تو اس کے بالوں کے گھنگھریالے لچھے ٹوپی کے گرد حصار باندھے رکھتے۔ اس نے ابھی بچپن کی چوکھٹ پار نہیں کی تھی کہ جانب علی شاہ پڑھنے کے لیے حیدر آباد چلا گیا' وہاں اس کا گھر تھا۔ کام کرنے کے لیے دو نوکر تھے۔ اس نے بی اے کیا پھر ایم اے۔ چچی کی زبانی اسے پتا چلتا رہتا اس دن حلیمہ نے اسے بھیجا تھا کہ پوچھ کر آ' سائیں کیا کہتا ہے۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا' اس کو دیکھنے کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ کئی سال ہو گئے تھے اسے دیکھے ہوئے' پتہ نہیں کیسا ہو گیا ہو گا۔ وہ سوچتی ہوئی اندر آئی' اسے دیکھا اور دونوں بغیر کچھ کہے سنے خاموشی سے محبت کی راہ چل پڑے۔

اپنے اندر چھپے جس جذبے کو وہ عقیدت سمجھتی تھی' وہ اس کی بھول تھی۔ جانب علی شاہ ہنستا مسکراتا بڑی شان سے مسند دل پر آ بیٹھا اور اس نے اپنے دل کی سلطنت اس کے حوالے کر دی۔

✿ ✿ ✿

لٹنے کا عمل ہمیشہ انسان کو مغموم کرتا ہے مگر یہ کیسا لٹنا تھا' جس نے اس کے اندر سرشاری بھر دی تھی۔ وہ اپنے دل کے لٹنے کا قصہ سب سے چھپانا چاہتا تھا۔

لوگ اس کا نام اچھالنے لگتے' اس کے کردار پہ انگلی اٹھاتے' اس بھولی بھالی لڑکی کو خواہ مخواہ بدنام کرتے۔ وہ سیدھے سادے طریقے سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اپنے والد کو رشتے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے باپ یا دادی سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ایک حجاب تھا' جو آڑے آ رہا تھا۔

اور اماں حلیمہ کہنا تو سب کو اطلاع دینے کے مترادف تھا۔ وہ تو سنتے ہی خوشی سے وہ دھمال ڈالتی کہ سارے گاؤں دوست و احباب میں خبر جنگل کی آگ کی مانند پھیل جاتی۔

"ولی محمد۔" اچانک ہی اس کے ذہن میں کوندے کی طرح اس کا نام چمکا۔ ولی احمد اس کا سنگی ساتھی' راز دار و دوست رہا تھا ہمیشہ سے۔ اچھی طرح یاد تھا جب اس کی عمر نے نو کے ہندسے کو چھوا۔

ولی محمد کی ماں اسے سائیں گدا محی الدین کے پاس لے کر آئی تھی۔ معصوم' بھولا بھالا ولی محمد سائیں محی الدین کو بہت اچھا لگا۔ انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر دعا دی تو اس کی ماں خوش ہو گئی۔

جانب علی شاہ قرآن پڑھ کر مدرسے سے لوٹا تھا۔ گدا محی الدین نے اس کو دیکھ کر اپنی بانہیں وا کر دیں۔ وہ دوڑ کر ان کے سینے سے آ لگا۔ انہوں نے اسے لپٹا کر پیار کیا' اور ولی محمد کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"جانب علی! یہ آج سے تمہارا بھائی اور دوست ہے۔"

جانب علی شاہ نے ولی محمد کو ہاتھ سے پکڑا اور اس کے ساتھ پکی دوستی کر لی۔

وہ دوستی ان کی اسی دن سے چل رہی تھی۔ ولی محمد آٹھ جماعتیں پڑھنے کے بعد کھیتی باڑی کرنے لگا اور جانب علی شاہ پڑھتا رہا۔ وہ جب بھی سندھ یونیورسٹی سے آتا' ولی محمد کو اپنا منتظر پاتا۔

اس کی سنگت و ارادت بڑھتی عمر کے ساتھ کم نہیں ہوئی' بڑھتی چلی گئی۔ جانب علی شاہ کو اپنے دل کی خوشی بیان کرنے کو کوئی سامنے چاہیے تھا تو سب سے پہلے ولی محمد ہی اس کے تصور میں آیا تھا۔

وہ باہر اوطاق میں آ گیا' ولی محمد اس کو آتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس کو لے کر سیدھا آم کے باغ میں آیا۔

نہر کنارے آم اور جامن کے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ بچپن سے یہ جگہ اس کی پسندیدہ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ ولی محمد کو اس جگہ لے کر آتا پھر ان کی نہ ختم ہونے والی باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو چچی کے مسلسل پیغاموں پر ہی ختم ہوتا۔ شام ڈھل جاتی اور وہ پریشان بیٹھی ہوتیں کہ جانب علی شاہ نہر کنارے بیٹھا ہوا ہے' کہیں سے کوئی سانپ وغیرہ نہ نکل آئے۔ وہ صبح کا گیا رات کو پلٹتا' وہ بیٹھا باتیں کرتا رہتا' پھل کھاتا رہتا۔

ولی محمد اس کی حاضری بھرتا رہتا' کبھی کوئی پھل کاٹ کر دیتا تو کبھی کوئی مشروب بنا کر' گھر جاتا تو ضرورت کی چیزیں کھانا وغیرہ لے آتا۔

اور آج بھی اسے لے کر ان ہی ٹھنڈی ہواؤں' درختوں کی چھاؤں میں لے آیا۔

"ولی محمد۔!" وہ تصور میں گم پکار بیٹھا۔

"جی سائیں۔!" مستعدی سے جواب آیا۔

"یار ولی محمد! تمہیں پتہ ہے بڑا زوردار ڈاکہ پڑا ہے میرے دل پر۔" اس نے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ کو روکا۔

ولی محمد ہمہ تن گوش بن گیا۔ "کون ہے وہ سائیں؟ وہ دھاڑیل (ڈکیت)؟"

"ہے ایک دھاڑیل۔" یہ سن کر ولی محمد بے اختیار ہنسا۔

"سائیں میرے' میں تو پوچھ رہا ہوں کہ میرے دلبر یار کو آخر کس نے لوٹا؟"

مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کنارے پھلانگ کر باہر کود آئی۔

"پہلے اپنے سنگتی (دوست) سے یہ پوچھنا ہے کہ وہ میری مدد کرے گا' بابا سائیں تک میری دلی مراد پہنچائے گا۔"

"حاضر سائیں! حاضر' ولی محمد آپ کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔ قربان ہو جائے گا' آپ کی خوشیوں پہ۔"

اس نے ایک ڈھیلا اٹھا کر نہر میں دور تک پھینکا۔

"تو پھر بابا سائیں سے جا کر کہو کہ جانب علی شاہ رئیس حسین علی کی بیٹی سدوری سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

ولی محمد کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا' اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"چاچا حسین علی۔۔؟" اس نے بہ دقت کہا۔

اس نے پھر تصدیق کی' کہیں اس کی سماعتوں کو سننے میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔

"ہاں ہاں' تمہارا چاچا رئیس حسین علی۔ بولو میرا ساتھ دو گے نا!" وہ اپنی دھن میں خوشی سے کہتا رہا۔ اس کی بدلتی کیفیت کو محسوس ہی نہ کر پایا۔

"ہاں سائیں!" بمشکل اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"مجھے پتہ تھا تم حیران رہ جاؤ گے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ رئیس حسین علی کبھی میرے لیے انکار نہیں کریں گے۔ ہاں میرے بابا سائیں مان جائیں' صرف ان کی طرف سے خدشہ ہے' اسی لیے میں ان سے بات کرتے ہچکچا رہا ہوں۔ بس تم ان تک میرا پیغام پہنچا دو اور یہ بھی کہہ دو کہ میں شادی اسی لڑکی سے کروں گا۔ اگر بابا سائیں چاہتے ہیں کہ میری شادی ہو جائے۔" وہ اپنی دھن میں بولتا چلا گیا۔

اور ولی محمد کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا' وہ جسے اپنا مرشد سمجھتا تھا وہ کس راستے پر جا رہا تھا' جہاں مدتوں پرانی عقیدت اور دوستی کا سلسلہ ہی ختم ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ سدوری' جس کا نام بچپن سے اپنے نام کے ساتھ سنتا آیا تھا' وہ سدوری اب سائیں کی محبوب نظر تھی۔

وہ سائیں' جس کے وہ پاؤں پڑتا' ہاتھ چومتا اور جوتیاں اٹھاتا تھا۔

✿ ✿ ✿

بہت سارے دن گزر گئے' ولی محمد کی واپسی نہیں ہوئی۔ جانب علی شاہ نے کئی پیغامات بھجوائے تھے مگر وہ نہیں آیا

تھا۔ بالآخر اس نے خادم حسین کو کہا کہ وہ اسے لے کر آئے۔ اسے رہ رہ کر حیرت ہو رہی تھی کہ آخر ولی محمد کیوں نہیں آ رہا۔ اس دن کے بعد نہ وہ اس سے ملنے آیا' نہ بابا سائیں سے بات کی۔ وہ بے چینی سے خادم حسین کا منتظر تھا کہ وہ کیا خبر لاتا ہے' شام کو خادم حسین نے آ کر اسے بتایا کہ ولی محمد تو کئی دنوں سے بیمار ہے۔

اسے شدید حیرت ہوئی' ولی محمد نے اسے کیوں نہیں بتایا' دعا دوا کسی کے لیے نہ کہلوایا۔ حالانکہ اس سے پہلے جب بھی وہ بیمار ہوا' اس کی ماں زندہ تھی تو وہ فوراً" دعا کے لیے دوڑی آتی' اس کے مرنے کے بعد بھی وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو خود آجاتا ورنہ کسی سے کہلوا بھیجتا۔

اس نے فوراً" خادم حسین کو جیپ نکالنے کو کہا جب اس کے گاؤں پہنچا تو مغرب کا وقت ہونے کو تھا۔ بخش علی اسے دروازے پر ہی مل گیا' وہ اسے لے کر سیدھا ولی محمد کے پاس آیا۔ ولی محمد کو اپنے استقبال کے لیے نقاہت سے اٹھتا دیکھ کر وہ فوراً" آگے بڑھا۔

"لیٹے رہو ولی محمد! لیٹے رہو۔" اس نے اس کے شانے تھپتھپا کر لٹا دیا۔ "یہ اچھی یاری نبھائی کہ اپنی بیماری کی اطلاع تک نہ دی۔"

اس کے لہجے میں شکوہ بھانپ کر ولی محمد نے نقاہت سے ہاتھ جوڑ دیے۔

"معافی مرشد۔۔۔ معافی۔۔۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔" وہ کمزوری سے بمشکل مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم تو ابھی بھی جل رہے ہو۔" ولی محمد اس کے سرہانے بیٹھا اس کی پیشانی سے ہاتھ ہٹاتا' بولنا بھول گیا۔

سدوری نئی دری ٹرنک سے نکال کر دوسری چارپائی پر بچھا رہی تھی۔

"سائیں! ادھر آجائیں' ٹھیک سے بیٹھیں۔" وہ بخش علی کے کہنے پر دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"سدوری! جا جلدی سے سائیں کے لیے چائے بنا کے لا۔" وہ تیزی سے باہر نکلی تو اسے لگا کمرہ سونا ہو گیا ہو۔ اس کے دل میں اسے کمرے میں روک لینے کی شدید خواہش اٹھ آئی۔ اس نے کچھ پیسے جیب سے نکال کر ولی محمد کو تھمائے۔

"اپنا علاج کرواؤ یار!"

"نہیں سائیں! نہیں۔ میں دوا لے آیا ہوں' اس کی ضرورت نہیں۔"

وہ ہمیشہ ولی محمد کو بیمار ہونے پر علاج کے لیے خرچہ دیتا تھا مگر وہ آج لینے سے انکاری تھا۔

"رکھ لو یار! دعا کے سمجھ کر رکھ لو۔" اس نے اس کے تکیے کے نیچے پیسے رکھ دیے۔ ولی محمد نے سر جھکا دیا۔

"میں جلدی حاضر ہوں گا سائیں! جیسے ہی طبیعت سنبھلی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میرا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں سائیں! ولی محمد تو آپ کا دیوانہ ہے۔ پتا نہیں یہ بیماری کے چند دن بھی اس نے آپ کے بغیر کیسے گزارے ہیں۔" بخش علی کہتے ہوئے ہنسنے لگا۔

"ہاں' ہمیں بھی ولی محمد سے خاص انسیت چلی آ رہی ہے' آج سے نہیں بچپن سے۔" اس نے مسکرا کر بخش علی کی بات کا جواب دیا۔

بخش علی ہاتھ باندھے دونوں چارپائیوں کے بیچ کھڑا تھا۔

"بیٹھ جاؤ بابا! بخش علی بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں سائیں نہیں' میں آپ کے حضور خدمت کے لیے کھڑا ہوں۔ آخر آپ ہمارے گھر چل کر آئے ہیں۔ آپ کے سامنے میں کیسے چارپائی پر بیٹھ سکتا ہوں۔ ہم تو آپ کے خادم ہیں۔" وہ اکڑا اکڑا بولا۔

"حسین علی نظر نہیں آ رہے؟" اس نے کوئی بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔ حالانکہ وہ حسین علی کا معمول جانتا تھا۔ وہ اکثر ان کے ہاں آتا تو عصر سے مغرب تک ذکر اذکار میں مشغول رہتا۔

اس کی ساری توجہ سارا دھیان سدوری کی طرف تھا۔ میں اس کی ایک جھلک دیکھ کر اٹھنا چاہتا تھا۔

بخش علی نے اسے بتایا کہ گاؤں کی کسی شادی میں گھر کی باقی عورتیں گئی ہوئی ہیں' اور اگر وہ اور رئیس حسین علی آجاتا تو اسے کھانا کھائے بغیر نہ چھوڑتے۔ وہ کوشش کے باوجود ان کی منتوں سے ہار مان لیتا اور اتنی دیر بیٹھنا عقل مندی نہیں تھی۔

شاید وہ سدوری سے اپنی نظریں نہ ہٹا پاتا' سب کو پہلے سے ہی شک پڑ جاتا' علم ہو جاتا تو اس کی مخالفت بڑھ جاتی۔

بخش علی اس سے باتیں کرتا رہا مگر وہ غائب دماغی سے ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ وہ اسی وقت چائے لے کر کمرے میں آئی۔

روشنی صرف اس کمرے میں ہی نہیں' اس کے دل میں بھی بھر گئی تھی۔ اسے اپنی دل کی تابانی اور لذت دیدار سے منعکس ہوتی روشنی بوکھلائے دے رہی تھی۔

ولی محمد نے سائیں کے منور ہوتے چہرے کو دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے سدوری کی نظروں سے ملیں' اسے لگا جیسے کائنات ایک نکتے پر ساکت ہو گئی ہے۔

"سائیں۔۔۔ چائے۔" بخش علی نے سدوری کے ہاتھ سے کپ لے کر اس کے سامنے کیا۔

اس نے اپنے ہاتھوں کی خفیف لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے کپ تھاما تھا۔

ولی محمد کو خوف سا ہوا کہ سائیں کہیں بخش علی کے سامنے عیاں نہ ہو جائے۔ اس نے سدوری کو نظروں سے باہر جانے کا اشارہ کیا' وہ فوراً" واپس پلٹی۔

کمرے سے سارا اجالا سمیٹ کر لے گئی۔ لالٹ ہاؤس اندھیرے میں ڈوب گیا۔ دیدار سے روشن ہونے والی آنکھیں بجھ گئیں۔

جانب علی شاہ نے جلدی سے چائے ختم کی۔ اگر وہ چائے بھی سدوری کے ہاتھ کی نہ بنی ہوئی ہوتی تو وہ کبھی بھی نہ پی سکتا تھا۔

وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

بخش علی نے بہت روکا کہ "ابا آئے گا تو ناراض ہوگا کہ مرشد گھر چل کر آیا' تم نے اسے میرے آنے تک بٹھایا کیوں نہیں۔" مگر وہ رئیس حسین علی سے ہی تو بھاگنا چاہ رہا تھا۔ سو معذرت کر کے واپسی کے لیے پلٹ آیا۔

اپنی نشست پر وہ خمار آلود کالی آنکھیں ثبت کر آیا تھا۔ اس کی پشت سدوری کی نظروں کی تپش سے جل رہی تھی۔

"وہ دن جلد آئے گا جب وہ میری ہوگی ان شاءاللہ۔" وصل کے خوابوں کو خود اس نے امید کا پانی دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سائیں محی الدین چاشت کے نوافل پڑھ کر بیٹھے تھے جب ولی محمد حجرے میں داخل ہوا۔ وہ آنے کو تو آ گیا مگر اب کشمکش میں بیٹھا سوچتا رہ گیا کہ بات کرے تو کیسے کرے۔ سائیں محی الدین نے وظائف کر کے اس کو بغور دیکھا۔

"ولی محمد۔۔۔؟"

"حاضر سائیں۔" اس نے فوراً" ہاتھ باندھے۔

"کچھ کہنا چاہتے ہو بابا!"

"جی۔۔۔ جی پیر سائیں۔" ولی محمد ہکلاتے ہوئے بولا۔

وہ خاموشی سے چند لمحوں تک ولی محمد کو دیکھتے رہے' وہ کچھ نہیں بولا تو کہا۔

"کہو وہ جو کہنا چاہتے ہو۔"

"پیر سائیں کی ناراضی سے خوف زدہ ہوں۔" ولی محمد نے ہاتھ باندھے نظریں جھکائے عاجزی سے عرض کیا۔

محی الدین کی گھنی داڑھی اور مونچھوں کے بیچ گھرے باریک ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم لہرایا۔

"کبھی والدین بھی اولاد سے ناراض ہوتے ہیں؟ کبھی چاہے جانے والا بھی چاہنے والے سے روٹھا ہے۔ بابا جو دل میں ہے وہ کہہ' دو بنا کسی خوف و جھجک کے۔" انہوں نے اس کی ہمت بندھائی۔

"پیر سائیں! دراصل میں۔۔۔" ولی محمد نے تھوک نگلا۔ "سائیں' جانب علی شاہ کی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

محی الدین آلتی پالتی مارے اپنے گھٹنے پر دوسرا پیر رکھ کر اس کی طرف متوجہ تھے۔

"سائیں! جانب علی شاہ' رئیس حسین بخش کی نیانی (بیٹی) سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

محی الدین کی دونوں بھنویں سکڑ گئیں۔ "تمہیں پتہ ہے ولی محمد تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جی سائیں۔" ولی محمد نظریں جھکا کر ادب سے بولا۔

"کیا تم جانتے ہو بچپن کی نسبت کو؟"

"جی سائیں!"

"پھر بھی تم یہ بات کر رہے ہو؟" وہ انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے مونچھیں سنوارتے ہوئے بولے۔

"پیر سائیں۔ ولی محمد کو تو آپ نے بچپن سے جانب علی شاہ کے ساتھ باندھ دیا' اب ولی محمد جانب علی شاہ کی خواہش کیسے ٹال سکتا ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔

"سائیں۔ ہم تو پروانے ہیں' ہمارا تو کام ہی جان دینا ہے۔ یہ تو ایک بچپن کی چھوٹی سی نسبت کی بات ہے۔ ولی محمد تو اپنا سب کچھ جانب علی شاہ پر وارنے کو تیار ہے۔"

"میں قدر کرتا ہوں تمہارے جذبے کی' محبت کی۔" محی الدین مسکرائے۔ "مگر میں ایسا نہیں کر سکتا ولی محمد! مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ رئیس حسین علی بھی ایسا نہیں کرے گا" اس لیے جانب علی شاہ کو کہو یہ بات دل سے نکال دے ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے کیونکہ یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔ اگر وہ سمجھ لے تو۔"

انہوں نے پرسوچ وگہرے لہجے میں کہا۔

"اب تم جاؤ۔"

وہ ہاتھ باندھ کر سلام کر کے باہر نکلا تو منتظر جانب علی شاہ اصطبل میں بندھے اپنے گھوڑے کی پشت بے چینی سے سہلا رہا تھا۔ وہ سیدھا وہیں چلا آیا۔

"پیر سائیں نے انکار کر دیا ہے۔" اس نے سوالیہ نگاہوں کو جواب دے کر نظریں جھکا لیں۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔

جانب علی شاہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔

چند ہی لمحات میں یہ کیفیت دل کے کواڑ توڑ کر اس کے پورے وجود پر چھا گئی۔ اس کے لیے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔

ولی محمد نے پریشانی سے آگے بڑھ کر اس کو تھاما۔

"سائیں سنبھالیں خود کو۔" وہ آب دیدہ ہو کر کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ ایک دم صدمے سے زرد ہو گیا۔ اگر وہ غصے اور جھنجلاہٹ سے سائیں محی الدین کے فیصلے پر احتجاج کرتا تو شاید حالت اتنی دگرگوں نہ ہوتی۔

ولی محمد نے اس کی زبان سے اف بھی نہ سنی' وہ اس کو سہارا دے کر اوطاق کے حجرے میں لے جانا چاہتا تھا مگر اس نے سر کے اشارے سے حویلی کی جانب چلنے کو کہا۔ وہ اس کو پکڑ کر حویلی کے گیٹ تک پہنچا۔

حویلی کے اندر جانب علی شاہ نے اپنی کٹی ہوئی شاخ ایسے وجود کو گھسیٹتے گھسیٹتے اپنے کمرے میں بستر کے حوالے کیا تو آنکھوں کے گوشے بھیگ چلے تھے۔ نمکین پانی اس کی آدھ انچ بڑھی ہوئی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ صدمے کے بوجھ تلے بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

سائیں محی الدین حویلی آئے تو سب سے پہلے اس کا پوچھا۔ "ظہر کی نماز پڑھنے کیوں نہیں آیا؟"

"پیر سائیں! وہ جب سے آیا ہے سو رہا ہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔" حلیمہ نے فوراً جواب دیا۔

"ایسا بھی کیا سونا کہ ظہر ہی قضا کر دی۔" ہمیشہ کی طرح انہیں غصہ آیا۔

وہ بچپن سے جانب علی شاہ کو اپنے ساتھ ہر نماز پر لے جاتے اور کبھی جو وہ ادھر ادھر ہوتا نماز نہ پڑھتا تو انہیں بہت غصہ آتا۔ انہیں لگتا کہ جیسے ان کی سالوں کی ریاضت مٹی میں ملتی جا رہی ہے۔

"تین بار تو میں نے بھی حلیمہ کو دیکھنے کو بھیجا' وہ اٹھا ہو تو کھانا بھی کھا لے۔ نماز بھی پڑھ لے۔"

بیبی سندھل کی بات سن کر وہ اس کے کمرے کی طرف چلے آئے۔

"جانب علی شاہ! بابا جانب علی شاہ!" انہوں نے تین چار آوازیں دیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ چلتے ہوئے اس کے سرہانے آ کھڑے ہوئے۔

وہ سیدھا لیٹا ہوا تھا' اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

سائیں محی الدین نے بے ساختہ اس کی پیشانی کو چھوا اور انہیں اپنا ہاتھ جلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ فوراً بیڈ پر اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ اس کے بال سہلا کر اسے جگانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے پیچھے آئی سندھل بی بی اور حلیمہ اس کو یوں بے سدھ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ بی بی سندھل حلیمہ پر غصہ ہونے لگیں کہ اس نے ٹھیک سے اس کو نہیں دیکھا۔ یہ تو بخار میں جل کر غنودگی میں چلا گیا۔ اور وہ انہیں آ کر بتاتی رہی کہ وہ سو رہا ہے پھر انہوں نے اپنے جوڑوں کے درد اور بڑھاپے کو کوسا' جس کی وجہ سے وہ خود اس کا خیال نہیں رکھ پا رہی تھیں۔

ان کی باتوں سے قطع نظر سائیں محی الدین ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے گہری سوچ میں ڈوبے تھے۔ وہ ازحد پریشانی سے اس کے زرد چہرے' بخار سے جلتے وجود کو دیکھتے رہے۔ وہ عشق کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ محی الدین شاہ جیلانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کے لیے جلتی آگ کو گلزار کریں تو کیسے' جبکہ وہ جانتے تھے کہ عشق کبھی اپنے چنگل سے آزاد نہیں کرتا۔

سائیں محی الدین جیلانی کی آنکھیں اپنی بے بسی پر بھیگ گئیں۔

ایک بار قیس حسین علی کے سامنے اس کو دست سوال دراز کرنا پڑے گا اور کیا قیس حسین علی ان کے سوال کو شرف قبولیت دے دے گا یا رد کر دے گا' مگر وہ یہ کیسے کر سکتے تھے۔ کیا ان کی حویلی میں آنے والے وہ لوگ جو ان سے عقیدت رکھتے تھے' ان پر اعتقاد رکھتے تھے' ان کا اعتماد نہیں ٹوٹ جائے گا۔ وہ یہ نہیں کہیں گے کہ سائیں ہماری

بہو بیٹیوں پر نظر ڈالنے لگے ہیں، ان کی سات پیڑھیوں پر حرف ملامت کے سائے لہرانے لگے۔ وہ یہ سوچ کر ہی کانپ اٹھے۔ فوراً" فیصلہ ہوگیا۔ وڈیرے رئیس حسین علی کے سامنے کبھی دست سوال دراز نہیں کریں گے۔ اپنی سات پشتوں کی عزت کی پاسداری کریں گے، ان کے نام پر ایک حرف بھی نہ آنے دیں گے۔"

وہ اپنے خاندان کی عزت پر جانب علی شاہ کو قربان کرنے کو تیار ہوگئے۔

اپنے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے کو جس کو انہوں نے بڑی محبت سے پالا تھا جس کی تربیت اپنی خاندانی اقدار کے مطابق کی تھی۔ وہ اپنے اس چمپئی رنگت، بڑی بڑی آنکھوں، کھڑی ناک، گلابی ہونٹوں، کالی داڑھی والے چھ فٹ کے بیٹے کو قربان کرسکتے تھے۔ انہیں اپنے معتقدین کی نظروں میں اپنا وقار قائم رکھنا تھا۔

☼ ☼ ☼

جس دل میں عشق مقیم ہوجائے، اس دل میں ہمیشہ درد کا دھواں بھرا رہتا ہے، جو پوری جان کو سلگائے رکھتا ہے۔ وہ بھٹی اس کو جلا کر نیست و نابود کرکے راکھ نہیں کرتی بلکہ اس کو پکا کر مضبوط کردیتی ہے پھر وہ ٹھنڈا میٹھا چشمہ بن جاتا ہے، جس سے ہر پیاسا اپنی پیاس بجھاتا ہے۔

جانب علی شاہ آٹھ دن تک بخار میں پھنکتا رہا۔ سائیں محی الدین آتے اور کھڑے کھڑے مزاج پرسی کے بعد باہر حجرے میں چلے جاتے۔ جیجی سند حل اس کے پلنگ کی پٹی سے بندھ کے رہ گئی تھیں۔ اس پر دعائیں سورتیں پڑھ پڑھ کے دم کرتی رہتیں۔ وہ حیران و پریشان تھیں کہ ان کے لاڈلے پوتے کو آخر ہو کیا گیا ہے۔

"پتہ نہیں میرے پوتے کو کس کی نظر لگ گئی ہے یا کسی حاسد کے حسد نے بیمار کردیا۔" وہ بولتی رہیں۔

"جا حلیمہ! آج پھر ولی محمد کو کہہ اونٹ صدقہ کردے، میرے جانب علی شاہ کے سر کا۔"

وہ مرغ، بکرا، گائے، بھینسیں سب صدقہ کرچکی تھیں۔ اب اونٹ صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ جب بھی اپنے خوبرو نیک طبیعت پوتے کو دیکھتیں تو ان کے ذہن کے دریچے پر رومی کا ایک شعر دستک دینے لگتا۔

ماہ روئی بعد سوئی مشکبو
نیک خوئی، نیک خوئی، نیک خو

(تیرا چاند سا مکھڑا ہے، گھنگھریالے بالوں مشک کی سی خوشبو وارہ ہے۔ تو نیک خو ہے نیک خو ہے، نیک خو)

اور جانب علی شاہ کے گرد اس نیک خوئی کا حصار ایسا بندھا تھا کہ بے بند جوانی کے سیلاب میں بھی جذبات کی لہریں بہک نہیں پائی تھیں۔ کسی غلط کنارے سے نہیں ٹکرائی تھیں۔

وہ نیک خوئی کی عملی تفسیر بن گیا تھا۔

مگر یہ کیا ہوگیا تھا اس کے ساتھ، کیسے محبت کے ہاتھوں تسخیر ہوگیا۔

وہ چت لیٹا ہوا سوچ کے دھارے پر بہتا چلا گیا۔ اس کی بند آنکھوں کی سامنے سونے جیسے روپ والی کھڑی مسکراتی رہی۔

"جیجی سند حل! رئیس حسین علی کی بیوی اور بیٹی آئی ہیں، سائیں جانب علی شاہ کی مزاج پرسی کے لیے۔"

حلیمہ کی آواز میں چھپے دیدار کے سندیسے نے اس کے دل کی دھڑکن کو تیز کردیا۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ مبادا الوہتا جذبہ آنکھوں سے چھلک نہ جائے۔ چہرے پر لکھی محبت کی عبارت پڑھ نہ لی جائے۔

رئیس حسین علی کی بیوی جیجی سے اس کے یوں اچانک تیز بخار آنے کے بارے میں پوچھتی رہیں، پیر سائیں کے اکلوتے سپوت کی صحت یابی کے لیے دل سے دعائیں مانگتی رہیں۔

"جیجی! ولی محمد نے رات آکر بتایا، بس صبح تک جیسے تیسے انتظار کیا، ساری رات بڑے رئیس کو اس کی فکر میں نیند نہیں آئی۔ کہا چل کر طبیعت پوچھ آئیں۔"

"ہاں بھلے آئے ہم لوگوں کا اپنا ہی گھر ہے۔"

"ہاں بس جیجی آپ کی محبتیں کھینچ لاتی ہیں، ہمیں۔ میں تو جب سے رئیس سے بیاہ کر آئی اپنا میکہ بھول گئی۔ لگتا کہ میرا میکہ سائیں کی حویلی میں آباد ہے۔"

جیجی مسکرائی اس بات پر سر اثبات میں ہلاتی رہیں۔

"سدوری کو بھی سر میں درد تھا، کہنے لگی جیجی سے دعا لینی ہے، دم کرانا ہے۔"

جیجی اس کو سوتا سمجھ کر مائی خیر بانو کو لے کر باہر چلی آئیں۔

وہ سراپا منتظر کہ موقع دیکھ کر ضرور آئے گی یا ہوسکتا ہے اماں حلیمہ ہی بھیج دے اسے کسی کام سے۔ یہ دعا مانگتا رہا۔ قبولیت کی گھڑی تھی کہ کچھ ہی دیر بعد حلیمہ نے اسے یہ دیکھنے کو بھیجا کہ سائیں سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اس کے من کی مراد بر آئی۔ وہ کمرے میں آئی تو وہ آنکھیں موندے پڑا تھا۔

وہ دونوں گھٹنے زمین پہ ٹیک کے بیڈ کی سائیڈ پر نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔

"سائیں! سائیں۔۔۔!" اس کی سرسراتی آواز سماعتوں تک پہنچی تو پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ نیچے بیٹھی اسے ہی تک رہی تھی۔

جانب علی شاہ کے بیمار چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"کیسی طبیعت ہے سائیں؟" گلابی لب ہلے تو آنکھیں بھر آئیں۔

وڑھے جن وڈھیاسی وری وتج سے ہی تمیا
مینڑا تنی پاس گھارتہ گھایل نہ تھئیس
(جس نے مجھے زخمی کیا پھر طبیب بھی وہی بنا، اے میرے دل! اسی کے پاس رہو تو گھائل و زخمی نہیں رہو گے۔)

وہ شاہ سائیں کے بیت میں حال دل کہہ کر وفور مسرت سے ہنس پڑا۔

اس کی خمار آلود آنکھیں خوشی و غم کی ملی جلی کیفیت سے بھر آئیں۔

جیہی جانھی تب بانی باروچین سا
محبت عوت پنہوں سال سوں کمینی کیہی
ہوو جا پائن پیر میں تنہیں جتی نہ جیہی
وسارے وئی تن کیچن کے آوس کین وہاں
(چاہے جیسی بھی نیچ ہوں، تب بھی ہوں آپ کی غلام، میرا آپ پر نہ دعوا کرنے کا اختیار ہے نہ دلیل دینے کی ہمت، جو آپ پیروں میں پہنتے ہیں میں تو اس جوتی جیسی بھی نہیں۔)
اتنے اعلا اور ارفع محبوب کو میں کیسے بھلا کر بیٹھ جاؤں گی۔)

اس نے کپکپاتی آواز میں شاہ سائیں کے بیت میں ہی جواب دیا۔

جانب علی شاہ کے ہونٹوں پر بڑی گہری اور دل فریب مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"تم تو میرے دل کی سلطنت کی ملکہ ہو، رانی ہو سدوری!"

"آپ کی نظر ہے سائیں! کچھ نہ ہوتے بھی بہت کچھ بنا دیا۔" اس کے رخساروں پر آنسو ڈھلکتے رہے۔

وہ نم پلکیں سے اس زمین پر بیٹھی خود کو اس کے پاؤں کی جوتی سے کم تر کہنے والی کو محویت سے تکتا رہا۔

اس وقت جیجی نماز پڑھنے کے بعد کمرے میں داخل ہوئیں تو دروازے میں ہی ٹھٹک گئیں۔ ان کے چہروں پر محبت کی روشنی تھی۔ وہ چاہت کی حرارت سے دہک رہے تھے۔ وہ چوکھٹ سے ہی پلٹ آئیں۔ جانب علی شاہ کی بیماری انہیں اب سمجھ میں آئی، اور پھر دن ڈھلے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ جب بولنے سے بھی لاچار جانب علی شاہ اپنے قدموں پر چل کر حویلی سے باہر نکلا تھا۔

باہر کھڑا منتظر ولی محمد اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

"مجھے پتا تھا کہ میرے سائیں دوا کس کے پاس ہے۔ تب ہی تو جا کر اطلاع دے آیا۔"

اور جانب علی شاہ نے آگے بڑھ کر ولی محمد کو محبت سے گلے لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

سندھ بی بی جس کو ماں نے لاڈ سے سند حل کہا تو وہی اس کا نام بن گیا۔ عرب سے ہجرت کرکے آنے والے جیلانیوں کی سندھ سے ان مٹ محبت کا بین ثبوت تھا کہ وہ سندھی سماج کے رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ اس سندھ کی مٹی کے جو سب کو اپنا لیتی ہے۔ اپنے سینے سے بہنے والے سندھو سے ان کی پیاس بجھا کر اپنی گود میں بٹھا کر کھلاتی اور پلاتی، خوش ہوتی رہتی ہے۔ بغیر کسی صلے کی تمنا اور محبت کی طلب کے۔

اس کی گود میں پناہ لینے والوں کے ظرف پر منحصر ہے کہ اس کو اسی کی طرح اپنا کر محبت کرتے ہیں؟ یا اس کا کھا کر اس سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر اس سمندر سے نکلتی دھرتی کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی گود سے خوشیاں، رزق، خوش حالی، آزادی لے کر اس سے محبت کرتا ہے یا نہیں یہ تو سمندر کی طرح وسیع ظرف کی مالک دھرتی ہے۔ آج سے نہیں تب سے، جب اس کو سمندر کے وجود سے کھسک کے اپنا پلو چھڑائے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ اور اس پر سندھو دریا اپنے لڑکپن کی مستی سے شیر کی طرح چنگھاڑتا، دھاڑتا، شور مچاتا، اپنے میٹھے پانی سے سرابیاں اور شماس پھیلاتا چلا جاتا تھا۔ اور جیجل سندھ نے اپنی گود میں کیا لے سوگھے جھیل کوہی، سنتال کو گود میں لے

اس کی خوش حالی کے گن گاتے سنتے ہنر مند ور اوڑا اس کی محبت و چاہت خوش حالی سے کھنچتے چلے آئے ہیں۔

اور پہلے سے رہنے بسنے والے کول سنتھال آپا مین کے ساتھ مل کر موہن جو دڑو کی عظیم تہذیب کے بانی بنے اور اس دھرتی کو اپنی محبت سے پُر کر کے شاندار ماضی دے کر تاریخ انسانی میں سرخرو فتح مند کر دیا۔ اور گزرے وقت کے ساتھ موہن جو دڑو کی تہذیب کے چندن ہار کو اپنے سینے پر سجائے جیجل سندھ کے حسن و محبت سے متاثر ہو کر شمالی قطب کے سائبیریا کے' سفید پربت سے چلے آنے والے خوب صورت لکھنے پڑھنے کے ہنر سے واقف آریہ لوگ' سندھو کے میٹھے پانیوں کے امرت سے سرشار ہو کر اس کی شان میں اشلوک لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔

اور جیجل سندھ کی گود ان کو بھی سمیٹ کر تاریخ عالم کی پیشانی پر اپنے امر ہونے کا اک اور ثبوت چھوڑ دیتی ہے۔ مادر سندھ کی ممتا کا سلسلہ دراز ہوتا چلا آتا ہے اور ہجرت زدہ مسافرت کے کوڑوں سے زخمی وجودوں پر وہ اپنی ممتا کے پھاہے رکھ کر ان زخموں کو مندمل کر کے ٹھیک کر دینے والی مسیحا بن جاتی ہے۔

جیجل "ماں" سندھ کی گود کی وسعت و کائنات بھی دیکھنے کی ہے۔ اور اس کا ظرف سمندر ایسا اور زمانے کے سرد و گرم' لوٹ مار' ظلم و بربریت کے ہتھوڑوں سے چور' وجود لیے ہجرت زدہ زخموں پر اس کی محبت' ممتا' مسیحائی کا سلسلہ سن سنتالیس تک چلا آتا ہے۔

کثیر اقوام کے لوگوں کو سنبھالتے سنبھالتے اس کے ہاتھ شل نہیں ہوئے۔ اعصاب نے جواب نہیں دیا ہے۔ ابھی تک بہت سارے زخم سہہ کر بھی بہت سارے درد سمیٹ کر بہت ساری دھتکار پا کر بھی' یہ جیجل امر سندھ دھرتی اپنے اصل سے نہیں ہٹی ہے۔ اس کی اصل آج بھی ویسی ہی ہے' جیسی ہزاروں سال پہلے تھی۔

مگر یہ تو بعد کی بات ہے۔ سندھل بی بی کے آباؤ اجداد اس سے بہت پہلے آ گئے کہ جب خون آلود سن سنتالیس تو بہت دور مستقبل کے کسی کونے میں پڑا تھا۔ جب اس کے جد امجد جو کہ بغداد شریف سے ہجرت کر کے شام کے شہر صماۃ میں آئے' اور پھر وہیں سے شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد تعلیمات اسلام کی روشنی لے کر سندھو دریا کی دھرتی کے دونوں اطراف پھیلتی چلی گئی۔

اور یہ بھی ان دنوں کے بعد کی بات ہے' جب جیمس برنس کو سندھو دریا پار کرنے پر سکندر اعظم یونانی کے بعد سکندر ثانی اور انڈس برنس تک کے خطابات سے نوازا گیا۔ اسی برنس کے بنائے ہوئے نقشوں پر چارلس نیپئر نے سندھ کو تالپوروں سے چھینا۔

اس صدی کے آخر میں پیروں کے گھر پیدا ہونے والی بچی کا نام سندھ سے اپنائیت و محبت کی وجہ سے سندھ بی بی رکھ دیا گیا۔ اور اس کی ماں اس کو دلار سے سندھل کہنے لگی۔ ذی سندھ بی بی اپنے تخت پر بیٹھی ہوتے جانب علی شاہ کی آنکھوں میں پریت کی جوت جلتی دیکھ کر آئی ہیں اور ان کا بوڑھا دل دھک دھک کر کے ماضی کی اور پلٹنا چاہتا ہے۔

"یا اللہ!" سندھ بی بی کے تسبیح والے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اور آنکھیں تو جیسے صدی پہلے کے دور میں گڑ جاتی ہیں۔ جب سندھ بی بی کی چاندی ایسی رنگت میں سرخیاں کھلی جاتی تھیں۔

دور دریائے سندھ کی لہریں اسی اور زور و شور سے بہتی تھیں۔

وہ سنہری شام جب سندھ کی دھرتی پر شفق اتر رہی تھی۔ پتا نہیں کیسے اس کی نگاہ سفید گھوڑے پر سوار سفید لٹھے کی شلوار بوسکی کی قمیص اور پٹکے میں کالا ہوا اسکٹ پہنے بندوق شانے پر لٹکائے' منہل سائیں کی میٹھی نگاہ سے جا الجھی تھی اور واپس نہیں آئی تھی۔ سو وہیں قربان ہو گئی تھی۔

سندھ بی بی چپکے چپکے رومال پر اپنی نازک دنفیس انگلیوں سے محبت کے گلاب کاڑھتی رہتی۔ اس کے صندوق میں رومالوں کی تہوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ مگر چاہنے کے باوجود ہمت نہ پڑی کہ یہ رومال جس کے لیے کاڑھے گئے تھے اسے بھجوا دے۔ سفید بوسکی کا نیکہ باندھنے والے منہل سائیں کا من بھی ادھر ہی لگا ہوا تھا۔ ان عورتوں کے جمگھٹے میں ہوا کے زور پر برقع کا نقاب اڑنے کے بعد ایک لحہ اس سفید گلابیاں گھلی رنگت والی سندھل بی بی کا روپ دیکھا تھا اور منہل سائیں راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ وہ اس روپ کا تمنائی بن گیا تھا۔

منہل سائیں کو یہ بھی پتا لگا کہ وہ سندھ بی بی جس کی زلف گرہ گیر کا وہ اسیر بن بیٹھا ہے۔ وہ اپنے ماموں زاد کی منگ ہے۔ گو کہ وہ لوگ جائیداد کے مسئلے پر اک دوسرے سے قطع تعلق کر بیٹھے ہیں۔ مگر یہ پھر بھی برادری کے قانون کے خلاف تھا کہ اک کی منگ کے لیے کوئی دوسرا رشتہ منظور کیا جائے یا بھیجا جائے۔ مگر محبت کب کسی رسم و رواج کو مانتی ہے۔

منہل سائیں کی ماں رشتہ لے کر سندھل بی بی کی دہلیز پر آ بیٹھی۔

شاندار' بااخلاق' عزت والے پاگارے کے رشتے سے سندھل کی ماں انکار نہیں کر پائیں اور بجلاری بھاگوں والی سندھ دھرتی کے سینے پر سندھل اور منہل کے وصل کا میلہ لگ جاتا ہے۔

بوسکی کا پٹکا باندھے منہل سائیں شب عروسی میں اس کے نازک ہاتھ پکڑے مبہوت سے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ آج وہ گلابیاں گھلی ہوئی سفید رنگت والی محبوبہ اس کی تھی۔ جس کی یادوں میں راتوں کو نیر بہتے اور نینیں جذب ہوتے۔ آج وہ سراپا سکاتی شرماتی لجاتی اس کے روبرو تھی۔

کتنے ہی دن گزر گئے۔

منہل سائیں کا دل باہر نہیں لگتا۔ وہ بہت کم گھر سے نکلتا' یار دوست اب تو مذاق اڑانے لگے تھے کہ منہل سائیں تو بیوی کے دامن سے بندھ گیا ہے۔ منہل سائیں ان کی باتوں کی وجہ سے اب باہر نکلنے لگا۔ مگر اس کا دل سندھل میں اٹکا رہتا۔ وہ فوراً گھر آ جاتا۔

ان کی شادی کو ابھی ایک ماہ ہوا تھا کہ منہل سائیں کو یار دوستوں نے کہا' بڑے دن ہو گئے شکار پر نہیں گئے۔ پہلے شادی کی مصروفیات بعد میں گھر کی' اب تو ساتھ چلو۔

منہل سائیں خجل ہو گیا' بادل نخواستہ ان کے ساتھ جانے پر راضی تو ہوا مگر دل اک دن کی جدائی بھی برداشت کرنے پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ شکار سے واپسی پر زمین پر نکل آیا۔ سوچا دیسے تو جانا نہیں ہو رہا آیا ہوں تو اک چکر ہی لگا لوں' وہ اپنے گھوڑے پر زمینوں کے گرد چکر ہی لگا رہا تھا کہ گھات لگائے بیٹھے سندھل کے پہلے منگیتر نے اس پر رائفل کا فائر کر دیا۔ منہل سائیں گھوڑے سے نیچے آ گرا۔ اس کا پٹکا جدائی کی طرح کھل گیا اور ہنستا مسکراتا بولتا منہل سائیں "آنا" "فانا" موت کے چنگل میں پھنس کر سندھل کی دنیا ویران کر گیا۔

اس نے بڑی خوشی خوشی مٹی کی ہانڈی میں کڑوا تیل ڈال کر کریلا مچھلی کا سالن بنایا تھا۔ منہل سائیں کو بے حد مرغوب تھا۔ وہ آیا تو سہی' مگر دوسروں کے کاندھوں پر۔ ٹھیک ایک ماہ ایک دن بعد ہی وہ سیج کے جس کی خوشبو ابھی باسی نہیں ہوئی تھی۔ اس پر منہل سائیں کی لاش رکھی تھی۔

ملن کا موسم روٹھ گیا۔ اور سندھل بی بی کی دنیا اندھیر ہو گئی' سیج لٹ گئی' سہاگ اجڑ گیا۔ سندھل کی تو ابھی شرم بھی رخصت نہیں ہوئی تھی۔ جی بھر کے منہل سائیں کو دیکھ بھی نہ پائی تھی۔ دیکھتی تو اس کی وارفتگی سے گھبرا کر نظریں جھکا لیتی تھی۔ وہ اس سے قیامت کی مسافت پر دور چلا گیا تھا۔ نینوں سے نیند روٹھ گئی تھی۔ درد نے بسیرا کر لیا تھا۔ سونی سیج اسے کسی کل چین نا لینے دیتی۔

لوگ کہتے سندھل بی بی کی گود تو سیج پر ہی ہری ہو گئی۔ محی الدین اس کی گود میں آ گیا مگر منہل سائیں کی یاد آج تک اس کی بوڑھی آنکھوں کی سفید پلکوں پر اٹکی ہوئی تھی۔ اس کی ساری جوانی ہجر کے تندور کا بالن بن گئی۔ اس کے قلب میں ازل سے قرب کا ایسا پیوند جڑا ہوا تھا جو دنیا میں جدا ہو کر بھی نہ چھنا نہ ٹوٹا' وہ دکھوں کو سیج پر سلاتے گئی۔

خوشی کا لفظ تو اسی دن سندھل بی بی کے لیے اجنبی بن گیا۔ جس دن اس کی سیج سونی ہوئی' منہل سائیں روٹھ گیا تھا۔ اس دن بھی خوشی کی اجنبیت اپنائیت میں نہیں بدلی جس دن محی الدین اس کی گود میں آیا۔

اس دن بھی' نہیں جب منہل سائیں کا قاتل پھانسی چڑھا۔

وہ کہتی قاتل کوئی میرے منہل سائیں کے برابر تھا۔ جو میں کہوں وہ انجام تک پہنچ گیا۔ منہل سائیں تو میرا محبوب تھا۔

کبھی کبھی وہ عبادت سے فارغ ہو کر مصلے پر ہی کمر سیدھی کرتی تو شکوے ان کے دل کے کونے کھدرے پھلانگ کر نکل آتے۔

"منہل سائیں تجھ سے زیادہ وفادار تو تیرے دیے چھوڑے کے دکھ نکلے' جنہوں نے ساری عمر میرا ساتھ تو نبھایا ہے۔ تیری یادیں' تیری محبت جو آج تک سانس میں گوندھی ہوئی ہے۔" منہل سائیں کا تصور ساری عمر اس کی آنکھوں کی منڈیروں پر بیٹھا رہا۔

اور یادیں دل میں مستقل پڑاؤ ڈالے پڑی رہیں۔

اس سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ آتش عشق کیسے جلاتی ہے۔ اس سے زیادہ کسے پتا تھا کہ ہجر کس طرح جان نچوڑتا ہے۔

"محبوب ۔ بے نیاز محبوب آف ۔ ہا ۔ ہا۔" سندھل بی بی

نے اک سرد لمبی ہجرزدہ آہ نما سانس بھری۔

"جانب علی شاہ میرے بچے! تو کس راہ پر چل نکلا۔"

ان کی سفید پلکوں پر آنسوؤں کی بوندیں اٹکنے لگیں۔ ان کے لب خاموش تھے تو تسبیح کے دانے ساکت' حلیمہ ان کے پیر دبانے لگی۔ وہ کبھی جیجی کو بغور دیکھنے لگی۔

"سندھل جیجی! کیا بات ہے؟" وہ بچپن سے رازداری نبھانے والی۔ ان کو یوں غمگین دیکھ کر بے چین ہو بیٹھی۔ سندھل جیجی دکھ کے سیلاب میں بہنے لگی۔

"حلیمہ! میرے جانب علی شاہ کو نیند کا نشہ چڑھ گیا ہے۔"

اور حلیمہ نے ٹانگیں دبانا چھوڑ کر دہل کر اپنا سینہ پکڑ لیا۔ کیا کچھ نہیں تھا اس سینے میں' بچپن سے ان کے درد سے بندھی آئی تھی۔ شادی ہوئی تو بھی اسی در کے اک خادم سے' بچے سب اپنے اپنے گھروں میں مصروف' اور حلیمہ سندھل بی بی کی خدمت میں مصروف' شاداں فرحاں رہتی آئی تھی۔

"ہائے جیجی! یہ کیا ہو گیا۔ تو یہ تھا سائیں جانب علی شاہ کا بخار۔"

اس کی بوڑھی آنکھوں کی آنسوؤں کے ساتھ بڑی طویل رفاقت رہی تھی' جو آج بھی قائم تھی۔

"ہائے۔ ہائے تمہیں کیا پتا حلیمہ! یہ آگ کیا ہے' کس طرح جلاتی ہے۔"

"جیجی۔ سندھل جیجی! پانچ سال کی عمر سے مجھ نمانی نے آپ کو تڑپتے' روتے' جلتے دیکھا ہے۔"

اس کے پاؤں دباتے ہاتھوں پر آنسو گرتے رہے اور لیٹی ہوئی بوڑھی سندھل بی بی کا تکیہ بھیگتا رہا۔

"حلیمہ!

آجھانمیں جون ازیں گجویا بجو

شاہ سائیں تو عشق کے میدان میں کھڑے ہو کر کہتے ہیں محبوب تجھے اپنا کر تو میرا ہو جا۔ ان کو صرف اللہ سائیں چاہیے' وہ صرف سوہنے رب کی رضا کے طالب ہوتے ہیں۔

مگر جانب علی شاہ تو ابھی سفر پر نکلا ہے' ڈرتی ہوں کہ من کے سفر سے تن کے سفر کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے۔" سندھل جیجی بے چینی سے اٹھ بیٹھیں۔

"سوہنے رب! میرے جانب علی شاہ کی حفاظت کرنا' اسے اپنی طرف آنے سے پہلے ایک ہی مجاز میں محو رکھنا' اسے دردر کی جوکھٹ چومنے سے بچانا۔"

وہ گڑگڑا کے دعا مانگتی رہیں اور حلیمہ آمین کی تکرار کرتی رہی۔

"مگر جیجی! سائیں جانب علی شاہ کو محبت ہوئی کس سے ہے؟"

"ارے حلیمہ۔ اسی لڑکی جو آج آئی تھی نا سدوری۔"

✡ ✡ ✡

چارپائی پر بیٹھا رئیس حسین علی نماز اور وظائف سے فارغ ہو کر درود شریف کا ورد کر رہے تھے۔

مائی خیر بانو شوہر کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ وہ درود پڑھ کر دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا مانگنے لگا۔

سدوری نے آ کر انہیں چائے کی پیالیاں تھمائیں' وہ بغور سدوری کو دیکھنے لگی۔

حویلی جانے کا سن کر اس نے کہا تھا۔ "میں بھی چلوں گی جیجی! سندھل سے سر درد کا دم کرانا ہے۔"

کیا واقعی اسے سر میں درد تھا' یا صرف بہانہ کیا تھا۔

وہ اسے لے گئی۔ وہ جیجی سے رخصت کی اجازت لینے گئی تھی۔ جیجی اور حلیمہ باتیں کر رہی تھیں۔ وہ سدوری کا نام سن کر ٹھٹک گئی اور پھر جو کچھ سنا' اس نے اسے دہلا دیا۔ وہ رخصت کی اجازت لیے بغیر الٹے قدموں چوکھٹ سے واپس پلٹی تو سدوری پر نظر پڑی۔ جانب علی شاہ کے کمرے سے نکل رہی تھی' اس کی آنکھوں میں محبت کی خمار آلود چمک' لبوں پر مچلتی مسکراہٹ نے اسے بہت کچھ بتا دیا۔

اس نے کڑے تیوروں سے بیٹی کو گھورا اور خود کو دل ہی دل میں کوسا کہ کیوں نماز پڑھنے کے بعد وہاں جائے نماز پر سو گئیں' سدوری اس وقت باورچی خانے میں حلیمہ کا کام میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔

انہوں نے جانب علی شاہ کے کمرے میں جھانک کر دیکھا' آنکھیں موندے پلنگ پر لیٹا مطمئن سا جانب علی شاہ جس کے گلابی لبوں سے مسکراہٹ پھوٹ کر نکلتی پورے چہرے پر روشنی سی بکھیر رہی تھی۔

گھر آ کر بھی اس کے تصور میں یہی مناظر گردش کرتے رہے۔ ساری رات بے چینی سے اسے نیند نہ آئی۔

رئیس حسین علی صبح صبح زمین پر چلا گیا۔ وہاں سے آ کر ظہر پڑھ کر سو گیا۔ وہ انتظار کرتی رہی' اس کے اٹھنے کا۔ اسی پریشانی کے عالم میں نا اس نے سر میں تیل ڈالا' نہ بال گوندھے' نا ہی کسی کام میں اس کا دل لگا۔ دونوں چوٹیوں سے مہندی رنگے لال بالوں کی باریک لٹیں نکل گئی تھیں۔ وہ اپنی سوسی کی چھ وال بھاری شلوار جھاڑ کر چوکی سے اٹھی۔

اور رئیس حسین علی جواب فارغ ہو کر چارپائی پر بیٹھے سڑک سڑک کر کے چائے سے شغل فرما رہے تھے' ان کی پائنتی آ کر بیٹھ گئی۔

اس کی سبز رنگ کی پرنٹڈ قمیص جس کے گریبان کے اندر ہی لمبی گہری جیب بنی ہوئی تھی' اور جیب کے گرد کڑھائی کر رکھی تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر سروتہ نکالا۔ سپاری کتری ہتھیلی پر رکھ کر رئیس کو پیش کی۔

"رئیس! اک گالھ کہوں پر وعدہ کرو تم غصہ تو نہیں ہو گے؟"

"نہیں ہوتا ناراض' میں تم بات کرو۔"

مائی خیر بانو اپنی لمبی چوڑی سوسی کی شلوار سمیٹ کر سرک کر اس کے اور قریب آئی۔

"رئیس! مجھے تو یہ بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا ہے۔"

رئیس حسین علی نے تفکر سے بھنویں سکیڑ کر بغور سوالیہ انداز میں پوچھا۔

مائی خیر بانو نے ایک لمبی سانس بھری۔ جو سنا اور دیکھا تھا رئیس کو بتا دیا۔

"پتا نہیں کیا بول رہی ہے تو' پاگل تو نہیں ہو گئی ہے۔"

اس نے سر جھٹکا۔

"رئیس! رب سوہنے دی قسم!" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں ملا کر اپنی دونوں آنکھوں پر رکھیں۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا۔"

رئیس حسین علی کے چہرے پر تفکر چھا گیا۔

"کیا ہو گیا' مرشد تو ہمارے لیے دعا لینے کا دروازہ ہے۔"

"میں خود یہی سوچ رہی ہوں۔"

رئیس حسین علی چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیاں لیے بت سے بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

✡ ✡ ✡

"ادی سدوری! تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

سدوری نے سر اٹھا کر حیرت سے ولی محمد کو دیکھا۔ عمر میں پہلی بار اس نے ادی کہا تھا۔

"مرشد سے دعا لینے گئی تھیں' ان کا دل ہی لے آئیں۔"

اس نے خوف زدہ ہو کر ولی محمد کو دیکھا۔

"ڈر نہیں ادی! ڈر نہیں۔ اب تو تو میری ادی ہے۔ تو میری طرف سے بے خوف رہ۔ میں تجھے اپنے یار کی امانت سمجھتا ہوں۔" ولی محمد سندھی ٹوپی پیشانی پر ٹکاتے بولا۔

چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"ادا ولی محمد!" اس نے بھی زندگی میں پہلی مرتبہ ادا کا لفظ ادا کیا۔ "مجھے لگتا ہے اماں کو شک پڑ گیا ہے۔ اس نے بابا کو بھی بتا دیا ہے۔ کل شام میں نے انہیں گھر پھر کرتے بار بار اپنی طرف گھورتے دیکھا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔

"اچھا!" ولی محمد پریشان ہو اٹھا۔ یہ نیا فضیحتا ہے۔" یہ کہتے وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

سدوری بھی سر جھکا کر مسکراہٹ دبانے لگی۔

"حاضر حاضر ولی محمد حاضر ہے۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "گندم کی بوائی سے فارغ ہو کر فورا" جاؤں گا۔"

چند دن بعد وہ جانب علی شاہ کے سامنے بیٹھا ساری صورت حال بتا رہا تھا۔

وہ بے چین ہو اٹھا۔ "اگر ایسا ہوا تو نہایت غلط ہوا۔ رشتہ مانگنے سے پہلے ان کو ہرگز ہماری محبت کا علم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ کیا ہو گیا' ولی محمد یہ کیا ہو گیا۔"

جانب علی شاہ پشت پر ہاتھ باندھے پریشانی سے ٹہلتا جاتا۔

جانب علی ٹہلتے ٹہلتے رکا۔ ولی محمد اسے رکتا دیکھ کر اس کے قریب ہو گیا۔ جانب علی شاہ نے اس کے گلے میں بانہ ڈال کر خود سے قریب کیا۔

"یار ولی محمد! میرے دل کو پہلے ہی چین و آرام نہیں ملتا۔ اوپر سے یہ پریشان کن خبر۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ اب کیا ہو گا ولی محمد؟" وہ پریشانی سے زرد ہوا جاتا تھا۔

ولی محمد' سائیں کے مضطرب و مضمحل وجود کو دیکھتے غمگین ہو اٹھا۔

سائیں کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔

☼ ☼ ☼

سائیں محی الدین شاہ جیلانی ماہانہ درس دے رہے تھے۔

وہ بہت دنوں بعد شریک محفل ہوا۔ سب اٹھ اٹھ کر جانب علی شاہ سے ملنے لگے۔ وہ چپ چاپ اک کونے میں بیٹھ گیا۔

سائیں محی الدین نے کچھ توقف کیا۔ پھر پانی کے چند گھونٹ بھرنے کے بعد سلسلۂ کلام پھر جوڑا۔

"عزیزان من! وقت کے اندر اک عجیب اسرار ہے۔ جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ یہ کیسا راز ہے۔ جو معمہ بنا ہوا ہے۔ اور کسی بھی نگاہ کی گہرائی اس تک نہیں پہنچ پا رہی۔"

جانب علی شاہ نے وعظ فرماتے' تسبیح والے ہاتھ سے داڑھی سنوارتے باپ کو اک نظر دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

"ہم سارے لوگ وقت کے آگے بے بس ہیں۔ یہ کیا ہے' کہاں سے آرہا' اور کہاں جائے گا' ہم لاعلم ہیں۔ حسن کو ڈھلنے سے روکنے میں ناکام' جوانی کو قائم رکھنے سے بے بس' ہمیشہ صحت تندرستی سے رہنے کی خواہش کے باوجود لاچار' ہم نہ اپنی مرضی سے دنیا میں آتے ہیں پر۔۔۔"
سائیں نے پانچوں انگلیاں سینے پر رکھیں۔
"نا اپنی مرضی سے دنیا سے جاتے ہیں۔ ہمارا اختیار تو کچھ بھی نہیں۔"

چند لمحے کی خاموشی چار سو چھائی رہی۔

"غور کریں تو ہماری ساری زندگی اک عجیب طرح کے غیب کا پہارتی ہے۔" سائیں محی الدین نے لفظ زندگی پر ہاتھ سے دائرہ بنایا۔

"ہمارا جو کل تھا' وہ کہاں گیا؟ اور ہمارا آج جو کل ہے وہ کہاں ہے۔" ان کی آواز کا زیروبم دلوں پر چھا رہا تھا۔ لوگ دم سادھے ان کا لفظ لفظ سنبھالتے رہے۔

"اور ہمارا آج۔۔۔" وہ متبسم ہوئے۔ "جو غیب سے آیا ہے۔ پھر گزرا ہوا کل بن کر غیب میں چلا جائے گا۔ یعنی ہمارے پاس' جو بھی ہے' وہ صرف آج ہے۔"

پیر سائیں نے اپنی شہادت کی انگلی مجمع کی طرف اٹھائی۔

"ہم صرف آج کا فلسفہ سمجھ جائیں اور اپنے آج کو بہتر کریں تو ہمارا جو آج کل بن جائے گا۔ جو آج کل آئے گا۔ دونوں مستطیع بن جائیں گے۔"

سائیں محی الدین نے نہایت گہری سانس بھری۔

اس سانس کی حدت کو مجمع میں موجود آدمیوں نے اپنے روئیں روئیں پر رینگتا محسوس کیا۔

"مگر عزیزان من! ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم "معدوم" کے پیچھے اندھا دھند دوڑتے ہیں۔ "موجود" کو چھوڑ دیتے ہیں۔"

سائیں محی الدین کی گہری' معنی خیز نگاہ جانب علی شاہ پر مرکوز ہوئی' اس نے نظریں جھکالیں۔

"ہماری کج فہمی تو دیکھیے کہ موجود کو چھوڑ کر معدوم کے پیچھے دوڑتے ہیں۔"

"موجود۔" ان کی آواز میں جوش بھر گیا۔ "کہ جن کے ہاتھ میں وقت کی باگ ہے۔ جو وقت کو چلا رہا ہے' بھگا رہا ہے' چھپا رہا ہے۔ اور وقت جس کا تابع ہے۔

"وہ" زمان و مکان سے ماوراذات کہ جس نے وقت کو "آیتہ العبرت" عبرت نشاں بنادیا۔ رات کو دن کے اندر پوشیدہ رکھا۔ اور دن کو رات کے اندر چھپا دیا۔

قانون فطرت یہ ہے کہ روشنی اندھیرے کو ختم کردیتی ہے یا اندھیرا روشنی کو فنا کردیتا ہے۔"

جانب علی شاہ کی آنکھیں اپنی بے بسی پر بھر آئیں۔
محبت اس کے اختیار سے باہر کا معاملہ تھا۔

محبت روشنی ہے۔۔۔ جدائی اندھیرا ہے
وصل روشنی ہے۔۔۔ ہجر اندھیرا
قربت روشنی ہے۔۔۔ فرقت اندھیرا

اس نے خود کو اندھیرے میں پایا۔ اس کے چاروں اور اندھیرے کا رقص جاری ہے۔ اس کا سر گھٹنوں پر آگیا۔

وہ دینی دنیاوی دونوں لحاظ سے اندھیرے میں تھا۔

یعنی فنا اور بقا دونوں اک دوسرے میں چھپے ہوئے ہیں۔
سائیں محی الدین کی آواز ابھری۔ "تو عزیزان من! پتا یہ چلا کہ اللہ کے عشق میں بقا پانے کے لیے فنا ہونا ضروری ہے' جب بندہ اپنی خواہش کو اپنے نفس کو فنا کرے گا تو ہی خدا کے شہہ رگ سے قریب ہو پائے گا۔"

☼ ☼ ☼

زرد شام اپنے پنکھ پھیلا کر دھرتی پر اترتی جارہی تھی۔
زرد پتے ہواؤں کے اکسانے پر ادھر ادھر ٹہلنے لگتے۔ پھر خاموش تھکے ماندے پیڑوں کے بوجھ تلے زمین سے چمٹ کر فنا ہو کر پناہ حاصل کرتے۔ ہواؤں کو غصہ آتا اور دھول ان پتوں کے ریزوں پر جم کر ان کو زمین کی قید میں دے دیتی۔ جانب علی شاہ انہیں سرکش ہواؤں کی زد پر زمین کے سینے پر پاؤں گاڑے صدیوں پرانے گھنے برگد کے پیڑ سے ٹیک لگائے اپنے محبت کے شکار وجود کو مٹی ہوتے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوگا؟" کا سوالیہ نشان اس کے آگے ناچتا رہا۔ وہ اس جلتی آنکھوں کے پیچھے چشم تصور کا شہر سجائے بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں طور ہوتی جاتی تھیں' وہ وہاں ہو کر بھی نہیں تھا۔

چشم تصور سے اس کو اپنے کچے صحن میں جھاڑو دیتے دیکھتا تو کبھی دوسرے کاموں میں مشغول روٹی پکاتے' لسی بلوتے' بھینسوں کو دھوتے' اس کے ذہن میں اس کا خیال بسیرا کیے ہوئے تھا۔

راستہ اور "منزل اور "نزدیک و دور کو دل کیا جانے' وہ تو دل نوازش میں مست ہے۔

عشق کی سرزمین پر بیٹھے ہوئے جانب علی شاہ کو حیرت کی ہوائیں کبھی کسی سوچ پر لا پھینکتی تو کبھی کسی خیال پہ۔ کبھی کسی یاد پہ تو کبھی کسی تجربہ۔ اس کے تصور میں گم ہو جاتے۔

جیجی کی بوڑھی عشق زدہ آنکھیں نیر بہاتی جاتیں۔ گلابی ہونٹ ہلتے اور بیت کہتی جاتیں۔ (نسوں تو دل جل کے راکھ ہوتا ہے۔ روؤں تو کھیل لگتا ہے۔ یہ میری آنکھیں محبوب کے وصل سے سیراب ہونے کے بعد ہی صبر کریں گی۔)

اور حجرے سے سائیں محی الدین کی دلوں کو گرماتی آنکھوں کو رلاتی آواز

بنا' جب حبیب جیسے' بندگی بے کار
کھوڑ کریں خیراتوں' یا کریں حج ہزار

تن ہاں بہشت بے زار' جن جو عشق نا ہے اللہ سال
(اگر تیری حب محبت' حبیب کے ساتھ نہیں تو تن لے تیری بندگی بے کار ہے۔ چاہے تو کتنی ہی خیر و خیرات کرے یا ہزاروں حج کرے' ان سے تو بہشت بھی بے زار ہے' جن کا عشق اللہ کے ساتھ نہیں ہے۔)

جانب علی شاہ کی سوچ عشق سے منسلک ہو کر بلندیوں کی جانب پرواز کررہی تھی۔

* * *

"میرے پیارے مالک سائیں! میں نے تجھ سے صرف منہل سائیں مانگا۔ تو نے مجھے دیا' پھر تیرا تھا تو نے لے لیا۔ میں تمام عمر صبر شکر کرکے تیری رضا پر راضی رہی۔

میں تجھ سے صرف ایک سوال کرتی ہوں کہ۔۔۔ میرے جانب علی شاہ کو سیدھی راہ پر چلانا' اسے محبت کرنا سکھایا ہے۔ مگر محبت کے پس پردہ فساد سے بچانا۔ اسے نفس کے فساد سے بچانا۔"

جیجی سند حل اپنے آنسوؤں میں ڈوبتی جاتی تھیں۔ اس روشن ضمیر کے دل کی روشنی اس کے چہرے پر منعکس ہورہی تھی۔

اس اکیلی لمبی چوڑی حویلی میں صرف ایک بوڑھی جیجی اپنی ملازماؤں کے ساتھ رہتی۔

اس حویلی نے اپنی مالکی صرف ایک سند حل بی بی کو سونپ رکھی تھی۔ عقیدت مند عورتیں اس بوڑھی جیجی کی محبت میں کھنچی چلی آتیں۔

جیجی کے علاوہ اس حویلی میں چند سال کے لیے اک عورت بھی آئی۔ جانب علی شاہ کی ماں جو اس کو جنم دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

اور بڑھاپے کی دہلیز پر بیٹھی سند حل بی بی نے اپنے کمزور ہاتھوں میں جانب علی کو سنبھال لیا۔

باپ' بیٹا کیا ایک سا مقدر لے کر آئے۔ باپ نے آنکھ کھولی تو باپ کی شفقت سے محروم' بیٹے نے آنکھ کھولی تو ماں کی ممتا سے محروم۔ جیجی کو ساری عمر قلق رہا۔

جانب علی شاہ نے بچپن سے جوانی تک اس بوڑھی کمزور جیجی کی شفقت کا سایہ دیکھا۔ اس جیجی کی محبت نے اسے محبت کرنا سکھا دیا۔ اس کی پرورش میں صرف محبت ہی محبت تھی۔

جیجی کی' سائیں محی الدین کی' خادموں' ملازموں' عقیدت مندوں کی' محبت ہر طرف محبت کا راج تھا۔ ہر طرف سے محبت نچھاور ہوتی رہی۔ جانب علی شاہ بھی لوگوں میں محبتیں بانٹنے لگا۔

مگر اچانک محبت کے نئے احساس سے روشناس ہوا تو یہ چوٹ سہہ نہیں پایا۔ اس چوٹ نے اس کو بلا کر رکھ دیا۔ صرف اسے ہی نہیں پیر سائیں اور جیجی کو بھی۔ اور جانب علی شاہ محبت کی راہ پر چلتا۔

اس کے اندر ہجر کی تپش بڑھتی تو وہ دل ہی دل میں کہتا۔
"محبوب کو دیکھنے کے کارن سانس لے رہا ہوں۔"

ولی محمد سمجھ جاتا' وہ چلتے پھرتے یہ جملہ سدوری کی سماعت کی نذر کر دیتا۔ سدوری سمجھ جاتی کہ آج جانب علی شاہ ملنے آئے گا۔

سدوری کو سندیسہ ملتا تو وہ مغرب کے بعد بستر پکڑ لیتی۔ آنکھیں موندے پڑی رہتی۔ سب اسے سوتا سمجھ لیتے بیچ رات اس کی مندی آنکھیں ملن کی حسرت سے کھلتیں تو آہستگی سے چارپائی چھوڑ دیتی وہ باہر نکل آتی اور دونوں محبت کے پنچھی ایک دوسرے کے دیدار سے آنکھوں کو سیراب کرتے۔ پھر واپس اپنے گھونسلوں کی اور پلٹ جاتے۔

☼ ☼ ☼

جانب علی شاہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا سید حماد عاکو جیجی کے قدموں میں آبیٹھا۔

جیجی نے دوپٹے سے آنسو خشک کیے۔

تسبیح تخت کے کونے پر رکھی۔ اپنے دونوں نرم گداز ہاتھوں کے پیالے میں جانب علی کا چہرہ تھام لیا۔

"جیجی! میرے لیے دعا کریں۔" اس کی بھیگی آواز نے جیجی کی آنکھوں کو بھگو دیا اک رنجور نگاہ اس پر ڈالی۔

"سات سال سے تو اس کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہا ہے۔ کوئی دعا قبولیت کا دامن پکڑے تیری زندگی میں اجالا نہیں بکھیر پائی۔ پتہ نہیں کیوں جانب! پتہ نہیں کیوں؟"

وہ تاسف سے بوڑھی ضعیف جیجی سندھل کو دیکھتا رہا۔

"اس حسرت بھری محبت نے کب کسی کو آباد کیا ہے' زندگی کے لمحے چن چن کر کھا لیے۔ محبت آخر اتنا درد کیوں دیتی ہے۔ محبت آخر ہے کیا؟ کیوں ہو جاتی ہے کہ اپنا وجود ماسوا محبت کے بے کار دکھنے لگتا ہے۔ یہ ہے کیا اور کیسے دو اجنبیوں کی سانسوں کی ڈور باندھ دیتی ہے۔ کیا ہے یہ رشتہ محبت؟"

"بیٹا! پندرہ سال تک تمہارے مقدر میں شادی نہیں۔" جیجی کا سر نفی میں ہلا۔ انہیں خواب میں آگاہی ہو گئی تھی۔

"جیجی! کیا میں پندرہ سال تک اس کا انتظار کروں گا؟" جانب علی کے رگ و پے میں بسنے والا کرب زبان پر آ گیا۔

"انتظار کی مدت کا تو سوہنے رب سائیں کو پتہ ہے جانب علی! پر مجھے تیرے مقدر کا رنج کھا گیا۔ سوچتی ہوں شاید خدا مجھ کمزور ناتواں گناہ گار کی دعائیں مرنے کے بعد قبول کر لے۔"

اس نے جیجی کی سرد آہ کا لمس اپنی پیشانی پر محسوس کیا۔ پیشانی چوم کر بالوں کا بوسہ لیا اور انگلیوں سے سر میں کنگھی کرنے لگیں۔

کچھ سوچ کر تخت کے کونے سے سبز دانوں والی تسبیح اٹھائی۔

"یہ رکھو بیٹا! کڑے وقتوں میں کام آئے گی۔ اس کے دانے تمہیں یاد دلائیں گے۔ اللہ سائیں کے ذکر کی۔ اس پر میں نے تیس سال ریاضت کا ذکر کی ہے۔ یا حی یا قیوم برحمتک استغیث۔" جیجی کی درد کے موتی چنتی آواز آنسوؤں سے لبریز ہو گئی۔

جانب علی شاہ کی آنکھیں ابھر رونے لگیں۔

روتے بلکتے سسکتے نوجوان پوتے کو جیجی نے پیروں سے اٹھا کر تخت پر بٹھایا سر اپنی گود میں رکھا۔

"اللہ! جانب علی شاہ کو سنبھال۔ یا اللہ! سائیں جانب علی تیرے حوالے۔

میں نے اس کے بکھرے اجڑے وجود کو تیرے حوالے کیا۔ تو ہی اس کو سمیٹ' تو ہی اس کو سنوار۔ اب مجھ بوڑھی پر رحم کر' رحم کر۔۔۔ رحم کر۔"

جیجی کی آواز کانپنے لگی۔ سر میں چلنے والی انگلیاں تھک کر سرد و ساکت ہو گئیں۔ گود کی گرمی ختم ہونے لگی۔

جانب علی شاہ نے آنسو پونچھ کر سر اٹھا کر جیجی کو دیکھا۔

جیجی کے سرد ہاتھوں و آنکھوں نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔

سرعت سے اٹھ کر جیجی کو سنبھالا۔

جیجی کے لب پر کلمہ پڑھا شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور آنکھیں موند لیں۔

روح نے جسم کا لبادہ اتار پھینکا۔ حویلی چمکتی آنکھوں' نورانی چہرے' دعا دیتے لبوں والی جیجی کے بابرکت وجود سے خالی ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

ولی محمد اس کا رفیق' یار غار' ہم راز' ہمدرد دوست' پیغامبر' قاصد' غمگسار سب کچھ تھا۔ اس ولی محمد کی منگ سدوری سے اس کو محبت ہوئی۔

اس بات کے بعد رئیس حسین علی نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ وہ رئیس حسین علی جو سائیں محی الدین کے عقیدت مند تھا۔ ان کا جگری دوست تھا۔ اس کی محبت اور عقیدت کو غیرت کھا گئی۔

وہ سال میں ایک بار آتا' یہی وجہ تھی کہ بیٹے کی دگرگوں حالت کے باوجود سائیں محی الدین نے رئیس حسین علی سے رشتہ مانگنے کی ہمت نہیں کی۔

"جانب! رئیس حسین علی کا گھر تیری منزل نہیں ہے بابا! لوٹ آئیں رستے سے۔" اور جانب علی ہاتھ باندھے سر جھکائے خاموشی سے ان کی نصیحت سنتا رہا۔

رئیس حسین علی کے گاؤں شاہ مراد پر صرف اس کے قدم ہی نہیں پڑے' پورا وجود گزر گیا تھا۔ اس راستے پر وہ پلٹتا تو کیسے؟

وہ کیسے سمجھاتا پیر سائیں کو کہ محبت اختیار سے باہر کا معاملہ ہے۔ اس کے اختیار میں پلٹنا ہوتا تو وہ اتنے سالوں تک اس کے بیاہ کے خواب سجائے منوں مٹی تلے جا سونے والی جیجی کی حسرت پوری نہ کر دیتا۔

کاش وہ ان کو دکھی کرنے کا باعث نہ بنتا۔ وہ ٹہلتا ہوا نہر کنارے آکر بیٹھ گیا۔ جہاں اس کی چارپائی پیپل کے درخت کے نیچے پڑی رہتی۔

ولی محمد نے اس کے سامنے رومال میں بندھا ٹفن بکس رکھا۔

اس کا ہر سردیوں کا معمول تھا۔ وہ اس کے لیے ساگ بنوا کر لاتا۔ اس ساگ میں سدوری اپنی چاہت بھی گھول دیتی۔

پتہ نہیں کس طرح موقع تلاش کر کے کتنے بہانے بنا کے وہ اس کے لیے ساگ اور چاول کے آٹے کی روٹی بھیجتی' سدوری کے ہاتھ کا بنا ہوا ساگ اور روٹی وہ کھاتا۔ تو اک اک نوالے سے اسی کا تصور نمودار ہوتا۔

سدوری ساگ کے پتے توڑ کر صاف کر رہی ہے۔ وہ اسے ساگ کے پتوں کو کئی پانیوں سے دھوتے دیکھتا۔

وہ چولہے پر ساگ چڑھاتی مسکراتی جاتی ہے۔ پکنے پر پانی نچوڑ کر کوٹ لیتی ہے۔ ہانڈی میں مکھن ڈال کر گرم کر کے لہسن ڈال کر سبز مرچیں ساگ کے پیڑے ڈال کر بھونے لگتی ہے۔ مکھن کتنی ڈالتی ہے۔ اک اک نوالے پر سدوری کا خیال رقص کرتا۔

اور جانب علی شاہ اس کو دیکھتا بے خیالی میں روٹی کھاتا جاتا۔ جب ساگ کا ڈونگا خالی ہوتا تو جانب علی شاہ اپنی بدخوبی پر ہنس پڑتا اور ولی محمد خوشی خوشی برتن واپس رومال میں باندھتا واپسی کی راہ لیتا۔

اس بار ولی محمد آیا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے یار؟" اس کو گلے لگا کر وہ پوچھ بیٹھا۔

"سائیں! بات کیا ہے۔ وہی چاچا کی ضد کہ شادی کر لو۔" ولی محمد کے لہجے میں بے دلی' بےزاری عود کر آئی۔

اور جانب علی شاہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی جو اک بات کبھی سوچی بھی تھی وہ کہنے کی ہمت باندھ لی۔ کیا اس کا ظرف ولی محمد جتنا ہے۔

"ولی محمد!" پکار پر اس نے جانب علی شاہ کی طرف دیکھا۔ جس کے لب کپکپا رہے تھے۔ آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

"تو اگر چاہے تو اس سے شادی کر لے۔"

الفاظ بمشکل اس کے منہ کا بند توڑ کر نکلے۔

"سائیں۔۔۔!" ولی محمد نے حیرت اور صدمے سے ابلتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "نہیں سائیں! نہیں مجھے ایسی گالی تو نہ دیں۔ ولی محمد اتنا بے حس تو نہیں کہ جس پر اس کے یار کی' مرشد کی نگاہ پڑ جائے اس کو قبول کر لے۔" وہ جانب علی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"اگر۔۔۔ مجھے قتل ہی کرنا ہے تو اور طریقے سے کریں' خنجر سے کریں' بندوق سے کریں' کلہاڑی سے کریں' زہر کا پیالہ پلا دیں یا نہر میں ڈبو دیں۔"

وہ ہاتھ باندھے جانب علی کے قدموں میں بیٹھا رقت سے کہتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سیلاب امڈ آیا۔

"مگر یوں' بدگمانی سے' بے اعتباری سے قتل نہ کرنا مجھے۔" وہ اس کے گھٹنے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

جانب علی اس کو یوں روتے سسکتے دیکھ کر' اس کے شانے دھیرے سے تھپکتے خود بھی رو پڑا۔

"ولی محمد! میرے یار! میں تم سے بدگمان نہیں بس صرف اپنا ظرف تمہارے ظرف سے ناپنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"سائیں! میرے یار! میرے لیے تو ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔" ولی محمد نے اپنے شانے تھپکتے اس کے ہاتھوں کو پکڑا' چوما' آنکھوں سے لگا لیا۔

"محبت مسلسل مشقت ہے۔ تھک سا گیا ہوں یہ قید محبت کاٹتے کاٹتے۔ اب تو درد لادوا بنتا جاتا ہے۔"

جانب علی شاہ' ولی محمد کو دلاسا دیتے سسک پڑا۔

"سائیں! وہ بچپن کی ایک بات تھی۔ اب تو وہ میرے یار کی محبت ہے۔ یار پر تو جان بھی قربان ہے۔ میری نظر میں اب وہ صرف آپ کی امانت ہے۔ سائیں! آپ کی

امانت۔" ولی محمد اس کا ہاتھ پکڑے سسکتا رہا۔
بچپن کی منگ اس نے یار پر' مرشد پر قربان کردی تھی۔

✿ ✿ ✿

"میں چاہتا ہوں ولی محمد کہ اب تیری شادی کردوں بابا! جو تھوڑی بہت تیاری کرنی ہے' وہ کرلے۔"
رئیس حسین علی نے حقے کی نے منہ سے نکال کر اس سے کہا۔
گھنی داڑھی مونچھوں' کھڑی ناک' باریک ہونٹوں' سرخ ڈورے والی آنکھوں اور سرخ و سپید رنگت والے ولی محمد نے اضطراب سے اجرک کا پلو دوسرے شانے پر مارنے والے انداز میں لپیٹا۔
"نہیں چاچا سائیں! میں یہ شادی نہیں کرسکتا۔"
"کیوں؟" رئیس حسین علی نے طیش سے پوچھا۔
"وہ میرے دوست کی امانت ہے۔ اس پر اس زاویے سے نگاہ ڈالنا بھی میرے لیے حرام ہے۔"
"بکواس بند کر ولی محمد! تجھے پتہ ہے کیا کہہ رہا تو؟ اپنی منگ کسی اور کو دے رہا ہے۔ بے غیرت! تجھے ہر حالت میں سدوری سے شادی کرنی ہوگی۔ وہ بچپن سے تیری منگ ہے۔" رئیس حسین غصے سے چوکی سے کھڑا ہوگیا۔
"اگر منگ بنائی تھی تو آپ لوگوں نے بنائی تھی۔ میں نے نہیں۔"
"ارے ایسا بے غیرت ہمارے خاندان میں کیسے پیدا ہوگیا۔" رئیس حسین صدمے سے چور آواز میں بولا۔
"دل چاہتا ہے۔ تجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالوں ولی محمد!"

"چاچا سائیں آپ کی مرضی' مجھے قتل کردیں' گھر سے نکال دیں۔ جائیداد سے عاق کردیں مگر میں کبھی بھی اوی سدوری سے شادی نہیں کروں گا۔" ولی محمد نفی میں سر ہلاتے ہوئے پرزور لہجے میں بولا۔
"بے غیرت' بے شرم' کمینے! تو خود بھی ذلیل و خوار ہونا چاہتا ہے۔ ہمیں بھی کرنا چاہتا ہے۔" رئیس حسین علی نے اپنی چھڑی اس کے شانوں پر ماری۔
وہ تڑپ کر جھکا' چھڑی پیٹھ پر پڑی۔ وہ زمین پر گر گیا۔
اور رئیس حسین علی اس کی غصے سے' غیرت سے چھڑی سے مرمت کرتا رہا۔ ولی محمد خاموشی سے مار کھاتا رہا۔

وہ اسے مارتے مارتے ہانپنے لگا تھا۔ چھڑی سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔
ولی محمد مٹی میں رلتا ملتا اس کے قدموں میں آگیا۔
"دیکھ چاچا سائیں! جانب علی شاہ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم دے دو اس کو رشتہ پھر پیر سائیں خود سوالی بن کر تیرے دروازے پر آئے گا۔ اس کو خالی مت لوٹانا چاچا!"
ولی محمد اس کے قدموں میں گرا ہاتھ باندھے منتیں کرتا رہا۔
"پیر سائیں کے بیٹے نے اچھا نہیں کیا' ارے اعتماد توڑا ہے ہمارا' ہم جو بڑے مان سے اپنی بہو بیٹیوں کو حویلی بھیجتے ہیں کہ وہ بھی ان کا اپنا گھر ہے۔ مرشد باپ کی شکل ہوتا ہے۔ کہہ دو تم جاکر پیر سائیں سے رئیس حسین علی کے پاس اس کا مرشد بن کر آئے تو سر آنکھوں پر' مگر رشتے کے لیے نہ آئے' خالی ہاتھ ہی جائے گا میرے در سے۔ سب کچھ ختم ہوجائے گا۔"
"چاچا! مان جا' چاچا مان جا۔" وہ ہاتھ جوڑ کر اک بار پھر گڑگڑایا۔
"نہیں' ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں۔" رئیس حسین علی کا سر انکار میں ہلا تو کبھی اقرار میں نہ ہل سکا۔

✿ ✿ ✿

جب انسان کی لگن کامل ہوجائے تو من کا اپنا وجود عدم ہوجاتا ہے' ہر طرف صرف محبوب نظر آتا ہے' اپنی ذات کے اندر باہر چاروں اور وہی دکھتا ہے۔
گھنٹوں گزر جاتے اسے اپنا آپ نہ ملتا' صرف و صرف محبوب رہتا۔ ایسے میں کوئی اسے پکارتا' اپنا آپ یاد دلاتا تو وہ بجھ جاتا۔ جھلا اٹھتا' عجب آدم بیزاری اس کے وجود پر چھائی رہتی' صرف خیال و تنہائی و خاموشی بھی لگتی۔
"تو بھول جا اسے جانب علی شاہ! بچہ تیرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں۔" بیبی کی نصیحت ماضی کو چیر کے بجلی کی طرح ذہن میں کوندی' بے چین ہوکر آنکھیں کھولیں۔
"کیا ہوگیا ہے مجھے۔ کچھ بھی نہیں بھاتا۔ طبیعت کسی بات' کسی چیز کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ دل کے گرد اکتاہٹ کا نامعلوم سا حصار بندھا ہوا ہے۔ دنیا سے بھی بےزار۔ سر پر جھنجلاہٹ سوار' کیا کروں کچھ سجھائی نہیں دیتا' نہ کچھ سمجھ میں آتا ہے۔"
"جانب علی! تو اس سے نہیں مل سکتا۔"
"تیرا اور اس کا کوئی ملاپ نہیں۔ چھوڑ دے اس کی

محبت کو بھول جا اس بدو چالی کو۔"

پیر سائیں کی باتیں اس کے کانوں میں گونجیں۔ اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔

"بابا سائیں! میں نے اس جہان بے ثبات میں محبت سے زیادہ طاقت ور 'پر جمال' پر کمال کسی چیز کو نہیں پایا' میں نے اس کے بڑے معجزے دیکھے ہیں۔ یہ پر سکون کر کے سکون چھینتی ہے۔ خوشی دے کر خوشی چھینتی ہے۔ دکھ دے کر دکھ چھینتی ہے۔

یہ اپنے سوا سب سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یکسو کر دیتی ہے۔"

سائیں محی الدین یک ٹک جانب علی کے بھیگتے لہجے کو دیکھتے رہے۔

ان کی آنکھیں اپنے ازلی عشق کے دکھ سے بھر آئیں یا جانب علی کی تپش سے 'وہ خاموش پر تفکر سے اپنی گھنی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگے۔ عبدالقادر جیلانی کی بغداد سے کوچ کرنے والی غزل کے اشعار ان کے لبوں پر آ گئے۔

خجلم تا قیامت چہ بگویم بیبات
کہ میان من وتو دوست چہا افتادست

(میں شرمندہ ہوں کہ کل قیامت کو میں کیا کہوں گا۔ ہائے افسوس اے دوست! میرے اور تیرے درمیان کیا فرق ہے۔ یعنی میرا دامن خطاؤں سے بھرا ہوا ہے۔ جبکہ تو ارحم الراحمین ہے۔)

سائیں محی الدین کی آنکھیں اپنے پر خطا دامن پر اشکبار ہو گئیں یا اللہ سائیں کے دامن پر رحمت پر۔

بہ زمین دے ہر کس بنشاند تخمے
بہ زمین دل ما تخم وفا افتادست

(دل کی زمین پر ہر شخص تخم ریزی کرتا ہے اور اللہ نے ہمارے دل کی زمین پر وفا کا بیج بویا ہے۔)

وجد نے پیر سائیں کو بانہوں میں لے لیا' یکے بعد دیگرے غزلیں۔ ان کے لبوں پر آتی رہیں۔

(گناہ کرنا اے بندے! اگرچہ تیری عادت بن چکی ہے لیکن اے میرے بندے! تیرے گناہوں کو معاف کرنا میری عادت ہے۔)

جانب علی شاہ کا دل سبحان اللہ کا ورد کرتا رہا۔

(توبہ کرنے والے گناہ گاروں کا سانس ہمارے لیے کستوری سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔)

"سبحان اللہ۔" (جس آدمی سے بد تر سارے جہاں میں اور کوئی نہ ہو۔ میرا انعام لاتقنطو من رحمتہ اللہ (اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو) اس کے لیے بھی تو ہے۔)

(جب اللہ تعالیٰ تیری بھلائی چاہتا ہے تو پھر غم کس بات کا۔ اگر شیطان تیرا دشمن ہے یا تجھ میں کچھ بری عادتیں ہیں تو پھر بھی بخشش کی امید رکھ۔)

جانب علی کا سارا وجود آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔

سائیں محی الدین اٹھے۔ دونوں ہاتھ جانب علی کے شانوں پر رکھے۔ آنکھوں میں جھانکا۔

(اے بلبل! تیرا عشق تو بس پھول کے ساتھ ہے' وہ بھی چند روزہ جبکہ ہمارا عشق تو عشق جاودانی ہے۔)

"لاتقنطو من رحمتہ اللہ" کی الوہی بولی جانب علی شاہ کے دل کے چمن میں گونجتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ سخت سردی کی رات تھی۔ جب محبت کی تپش نے اس کو اپنے عالی شان گرم کمرے سے باہر ٹھٹھرتی سردی میں لا پھینکا۔

اس نے جسم پر خاکی سویٹر پہنا ہوا تھا۔ گھوڑوں کے اصطبل کی طرف بڑھتے دیکھ کر خادم حسین اس کے پیچھے دوڑتا آیا۔ تب تک وہ اپنی سفید گھوڑی پر سوار ہو چکا تھا۔

"سائیں جی' یہ شال لے لو۔" خادم حسین کو اس کے وحشت زدہ وجود کو دیکھ کر روکنا بے سود لگا۔

"بہت کڑاکے کی سردی ہے سائیں!" اس نے عجلت میں اپنے شانوں سے اونی شال اتار کر تھمائی۔

اس نے جلدی سے شال لے کر اچھی طرح سے لپیٹ لی۔ تیزی سے گھوڑا دوڑا کر نکل آیا' گھوڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ تیزی سے نیم' ببول' بیری' کھجور' جامن کے درختوں کو پیچھے چھوڑ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ پلک جھپکنے میں وہ اس کے پاس پہنچ جائے۔ ایک ایسا شدید احساس اس پر حاوی تھا کہ وہ سب کچھ بھول بیٹھا۔ یہ بھی کہ وہ اس سردی میں کیسے اس کو بلائے گا۔

عام حالات میں وہ کبھی اتنی سردی میں رات گئے باہر نہیں نکلتا۔ وہ بھی گھوڑے کی سواری سردیوں میں۔

شام کے بعد اکثر جیپ کی سواری استعمال کرتا۔ مگر جب اس کے گاؤں جانا ہوتا تو حد درجہ احتیاط سے کام لیتا۔ کبھی جیپ میں نہیں گیا کہ سناٹے میں گاڑی کی آواز پر گاؤں کے

لوگ جاگ جاتے۔

دور سے گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر دوڑے آتے کہ کون آیا ہے۔ اتنی رات گئے۔

وہ تو گھوڑا بھی دور جنگل میں باندھتا کہ کہیں اس کی ٹاپوں کی آواز کوئی سن نہ لے۔

آج وہ بے سدھائی ہوئی گھوڑی پر بیٹھا تھا۔ وہ بار بار اس کے کنٹرول سے نکل جاتی۔ ہنہنا کر دوسری راہ لینے لگتی۔ اس کے پاس چابک نہیں تھا۔ وہ غصے سے گھوڑی کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارتا اور اپنے راستے پر چلانے لگتا۔ مگر آج جس راہ پر وہ جا رہا تھا۔ اس پر رکاوٹ تھی شاید۔ گھوڑی نے بے تحاشا تنگ کر رکھا تھا۔ کبھی کسی کھڈے میں پاؤں ڈالتی۔ کبھی راستہ بدلتی۔ کبھی آگے چلنے سے منکر' وہ مار مار کر اسے چلنے پر مجبور کرتا رہتا۔ جب تک وہ اپنے گاؤں کی حدود میں تھا۔ گھوڑی اس کی تابعدار تھی۔ جیسے ہی وہ سدوری کے گاؤں کی پگڈنڈی پر پہنچا۔ وہ اس کے اختیار سے باہر نکل گئی۔ وہ اس وقت پریشان تو تھا۔ مگر لوٹ کر واپس جانے کا خیال اس کے ذہن میں بھٹک کر بھی نہیں آیا۔

اک عزم کا طلسم دل کے بیچ گڑا تھا
آج اس سے ہر صورت ملنا ہے

اس کے بے قابو دل نے پورے وجود کو بے قابو کر دیا تھا۔ گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر گھوڑی نے آگے چلنے سے صاف انکار کر دیا۔ ہنہنا کر پیچھے کی طرف پلٹی دوڑی' وہ اسے قابو کرنے کے چکر میں گھوڑی سے گر پڑا۔ جب تک چوٹ سہلا کر اٹھا۔ تب تک گھوڑی واپسی کے رستے پر دور جا چکی تھی۔

اب گھوڑی کے پیچھے چلنا' بھاگنا' پکڑنا' بے سود تھا۔ وہ پیدل ہی اس کے گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

اس کے اندر دہکنے والی عشق کی آگ نے باہر کی سردی کو ناکے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جو آگ اسے دوڑائے جاتی تھی۔ وہ ہجر کی آگ تھی۔

وہ اس کی ڈیوڑھی کے سامنے ایستادہ نیم کے اس پیڑ کے نیچے آکھڑا ہوا۔ جہاں ولی محمد موسم گرما میں چارپائی ڈال کر بیٹھا رہتا۔

وہ کتنی ہی دیر اندھیرے میں اس ڈیوڑھی کو تکتا رہا' ہر طرف سناٹا اندھیرے کا ہاتھ پکڑے بکھرا پڑا تھا۔ بادلوں کی درزوں سے چاندنی کسی کنواری دوشیزہ کی طرح جھانک رہی

تھی۔

اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سدوری کو کیسے باہر بلائے' انیس سال اس نے نہایت احتیاط و رازداری سے ملاقاتیں کی تھیں کہ کسی کو آج تک بھنک تک نہ پڑی کہ جانب علی سال میں ایک دو بار ملاقات کرنے آتا ہے۔ پیر سائیں نے جب سے منع کیا تھا۔ وہ نہیں گیا تھا۔ آج ڈیڑھ سال بعد بے تابی دل نے ان کی حکم عدولی کی جرأت کی تھی۔

"کیا کروں؟ گھر کے اندر کود جاؤں؟ یا ولی محمد کو بلاؤں؟ مگر اس کو بلانے سے تو سب جاگ جائیں گے۔"

وہ مختلف طریقے سوچ سوچ کر تھک گیا مگر واپسی کا خیال اک بار بھی ذہن میں نہیں آیا۔ سوچ نے اس کے تھکے ذہن میں دراڑیں ڈال دیں۔ چیخ اٹھا۔

"آج تو اس سے ملنا ہے۔ ورنہ لگتا ہے جانب علی شاہ تو مر جائے گا۔" اس نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔

"یا اللہ! آج تو محبوب سے میل کرا دے۔ مالک! یہاں تک آ گیا ہوں۔ تو مایوس نا لوٹانا۔" اس کا دل دعا کی چوکھٹ پر پڑا رہا۔ اللہ کو اس کی محبت پر رحم آ گیا۔

وہ باہر نکلی تھی بے چین ہو کر۔ اس نے تیزی سے اس کو بازو سے پکڑ کر روکا' وہ بے اختیار چیخی۔ مگر اس سے پہلے کہ یہ چیخ فضا میں ارتعاش پیدا کرتی۔ جانب علی اس کے سامنے آ گیا۔

سدوری دم بخود رہ گئی۔ اس نے اس کے منہ پر رکھے ہاتھ کو ہٹا لیا اس کے گلابی لب کپکپائے۔

"س۔۔۔ سائیں آپ؟" وہ خوشی سے بے اختیار رو پڑی۔

"شکر ہے خدا کا' تم جاگ رہی تھیں اور اللہ سائیں نے تمہارے من میں یہ بات ڈال دی کہ کمرے سے باہر نکل آؤ۔" اک ہاتھ میں پکڑے اس کے ہاتھ کی پشت پر دوسرے ہاتھ سے تھپکی دے کر اس نے مسرت سے کہا۔

وہ یک دم اس کے قدموں میں بیٹھی۔ اپنے دونوں ہاتھ اس کے پاؤں پر رکھ دیے۔

تھورا جے تھوراموں نے مار ومٹن جا
تھر میں وادی تھوڑی تیں بی ہاں گھنیرا
بھلائیوں بھیرا آوس گنے گنیندس کیرا

(اے میرے محبوب! آپ کے تو مجھ پر احسان ہی احسان ہیں' جتنی تھر میں ریت۔ آپ کی بھلائیاں ملنے آنے کے احسان میں گننا چاہوں تو گن نا سکوں گی۔)

وہ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

ماٹھو سبھئی سوہنا۔ پکھی سبھ نہ ہنج
گنبہ کنبھا ٹھو مُنجھا اچے بو بہار جی

(لوگ سب ہی حسین نہیں ہوتے پرندے سارے ہنس نہیں ہوتے۔ کسی کسی انسان میں ہی بہار کی خوشبو آتی ہے) اس نے شاہ لطیف کے بیت کے جواب میں پھر شاہ سائیں کا بیت پڑھ کر بازو سے تھام کر اٹھایا۔

جانب علی شاہ کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ وہ اس کو اداس اور کچھ کمزور لگ رہی تھی۔ اس پر بڑھتی عمر نے کچھ اثر چھوڑا تو تھا مگر اتنا نہیں۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح خوب صورت تھی۔ اس کا وجود آج بھی اسی دن کی طرح ہی گلابی تھا۔ جس دن وہ اس کے وجود کا طلب گار بنا تھا۔ وہ آج بھی طلب گار ہی تھا۔ وہ آج بھی اسیر ہی تھا۔

"کچھ کمزور لگ رہی ہو مجھے۔ طبیعت ٹھیک ہے نا؟" وہ فکر مند ہوا۔

"سوہنا سائیں! من کے اندر آپ کی جدائی کی ایسی کٹار پڑی ہے۔ جو مجھے اندر سے ریزہ ریزہ کر رہی ہے۔ مٹھا سائیں! اب وچھوڑا برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔" ایک بار پھر آنسو اس کے رخساروں کے بوسے لینے لگے۔

"رئیسانی! تم میرا مقدر ہو۔ تم میرے علاوہ کسی کی نہیں بن سکتیں۔ سوہنے رب سائیں نے تمہیں میرے لیے ہی بنایا ہے۔ انیس سال سے ہم دونوں ایک دوسرے کے نہیں بن کر بھی ایک دوسرے کے ہی رہے۔"

اس نے طویل بات کے اختتام پر بہت دھیمے سے گہری سانس چھوڑی۔ اس سے سدوری کا دل چاہا۔ اپنے سائیں پر قربان ہو جائے۔ اس کے پاؤں چوم کے۔ قدموں پر سر رکھے اور جان دے دے۔

"اڑے کیر آہیں؟" (ارے کون ہو؟) بخش علی کی گرجتی آواز پر دونوں ششدر و ہراساں رہ گئے۔

"سائیں! جلدی کرو' نکل جاؤ۔" سدوری آب دیدہ ہوئی۔

"تمہیں چھوڑ کر؟" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

"سائیں! خدا کے واسطے نکل جا' وہ ہتھیار لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔" وہ منتیں کرنے لگی۔

"نہیں ..... نہیں۔" جانب علی شاہ کے لہجے میں ہمالیہ کی سختی در آئی۔

"اپنی جان بچانے کے لیے کمزور کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں! تمہیں سدوری نہیں' جانب علی شاہ مرد ہے۔"

"خبردار ... خبردار اگر اپنی جگہ سے ہلے بھی تو گولی مار دوں گا۔" بخش علی بندوق تان کر آیا تھا۔

"کون ہے تو سامنے آ۔"

وہ سدوری کی جانب منہ کیے کھڑا تھا۔ بہت آہستگی سے سدوری کو اپنی اوٹ میں لیے پھرا۔

"جا ... نب ..... علی ..... شاہ! تو ..... تو؟" بخش علی غصے سے کانپنے لگا۔ "تو ہمارے گھر میں گھس کر ہماری عزت اتارنے آیا ہے تو لاکھ ہمارے مرشد کا بیٹا سہی' پر میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"بخش علی! زبان سنبھال کر بات کر' جانب علی شاہ عزت اتارنے والوں میں سے نہیں' عزت رکھنے والوں میں سے ہے۔" اس نے گرج کر کہا۔

"ہماری چار دیواری کا تقدس پامال کر کے رات کے اندھیرے میں سدوری سے ملاقات کر رہا ہے اور بولتا ہے کہ عزت رکھنے والوں میں سے ہے۔ جھوٹ بولتا ہے پیر! تو جھوٹ بولتا ہے۔"

طیش سے کہتے بخش علی نے نشانہ باندھنے کو بندوق' نال سیدھی جانب علی شاہ کی طرف کی۔ شور پر ولی محمد آخری کمرے سے باہر نکلا۔ صحن کے بلب کی ہلکی زرد روشنی میں کھڑے جانب علی کو دیکھا۔ اس کے اندر پارہ بھر گیا۔ ایک ہی جست میں بندوق کے آگے آیا۔

سدوری سسکتی رہی۔

"سائیں کیوں ڈال لیا خود کو مصیبت میں جیسے ہی بخش علی ہتھیار اٹھائے گیا۔ چلے جاتے میری پروانہ کرتے۔"

"کیسے نہ پروا کرتا' تمہاری محبت تو میرے روئیں روئیں میں بسی ہے۔"

جانب علی کا لہجہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔

"بخش علی! خدا کے لیے خدا کے لیے سائیں پر گولی نہیں چلانا۔ عاقبت خراب ہو جائے گی۔ مرشد کا بیٹا ہے۔" وہ اس کے آگے ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگا۔

"ہٹ جا ولی محمد! ہٹ جا میرے سامنے سے ورنہ آج میں تمہیں بھی ان دونوں کے ساتھ گولی مار دوں گا۔ مرشد تب تک مرشد ہے' جب تک عزت کرے اور کروائے۔ ایسے مرشد سے تو اندھیر بھلا اندھیر۔" بخش علی کے سر پر خون سوار تھا۔

ولی محمد کو غصہ آگیا۔ "ارے خدا کا واسطہ بخش علی۔ ارے نبھاگا (بدنصیب) سید کا قاتل بن کر اٹھے گا۔ ارے کیا منہ دکھائے گا۔ قیامت میں کیسے سر اٹھائے گا۔ بول' بخش علی! بول' کیوں اندھا ہو رہا ہے۔ بدبخت ادھر دے' بندوق مجھے ادھر دے۔" ولی محمد چیخ چیخ کر اس سے بندوق چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔

"اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ کسی مسلمان کے گھر بغیر اجازت نہ جاؤ۔ مسلمان کو مسلمان کی عزت و جان و مال حرام ہے۔ پھر یہ ... یہ جو مرشد کا بیٹا ہے۔ یہ کیوں ہمارے گھر میں گھس آیا ہے۔ ارے' یہ تو ڈکیت ہے ڈکیت۔ میں کیسے چھوڑ دوں اس کو۔" وہ اور بپھر گیا۔

"بخش علی! خدا گواہ ہے۔ میں چور نہیں۔ رکھوالا ہوں۔ محبت میری ازل کی تقدیر ہے' جو میں نے ضرور کی۔ پر بھٹکنا شیطان کا بہکاوا ہے۔ جس سے آج تک میرا نفس محفوظ رہا۔ اور تمہاری عزت میری عزت۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "یاد رکھنا کوئی اپنی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ تو یقین کرے یا نہیں۔ تمہاری مرضی ہے۔ جانب علی شاہ نے اگر کوئی جرم کیا ہے تو صرف محبت کا اور بس۔"

اس کے حتمی لہجے کی مضبوطی نے سب کو دم بخود کر دیا۔

"ادا چاچا ... ادا چاچا! ہماری قیامت نہیں ہوگی۔ اگر مرشد کے بیٹے کی لاش ہمارے گھر سے جائے گی۔ چاچا سمجھا اپنے نا سمجھ بدبخت بیٹے کو سمجھا' جو ابھی تک مرشد پر بندوق اٹھائے کھڑا ہے۔" ولی محمد سر پیٹنے لگا۔

رئیس حسین علی ابھی تک ساری کارروائی دکھ' صدمے' غصے کی کیفیت سے دیکھ رہے تھے مگر ولی محمد کی مسلسل منتوں کے بعد آگے بڑھ آیا۔

"مرشد کو نشانے سے ہٹا لے بخش علی۔ قیامت تو دور کی بات ہے۔ ربا! میں تو پیر سائیں محی الدین کو بھی منہ نہیں دکھا سکوں گا۔" وہ بیٹے سے بندوق چھین کر جانب علی شاہ کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"جانب علی شاہ اگر تو میرے مرشد سائیں کا بیٹا نہ ہوتا تو یہ رئیس حسین علی تجھے اپنے ہاتھ سے قتل کرتا۔ اپنے ہاتھ سے۔" دونوں ہاتھ اس کے آگے کرتے وہ بولتے ہوئے رو پڑا۔

"تو چلا جا سائیں! تو چلا جا۔"

جانب علی نے جھکا ہوا سر اٹھا کر روتے کانپتے دکھ و صدمے سے لرزتے۔ باپ کے بوڑھے باریش دوست کو دیکھا۔ دکھ اس کے وجود پر بھی اگنے لگا۔

"رئیس حسین علی! میں بہت شرمندہ ہوں۔ مگر میں نے ... میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔" اس کی آنکھیں انجانے احساس سے جلنے لگیں۔ لہجہ بھیگ گیا۔ "محبت میرے اختیار سے باہر کا معاملہ ہے۔ بخدا اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں کبھی بابا سائیں کی روایت سے نہ ہٹتا۔"

"بس ... سائیں! بس باتیں نہ کر۔ چلا جا ادھر سے بہت ذلیل کیا ہے ہمیں۔" بخش علی تلملایا۔

"ایسے نہیں جاؤں گا۔ رئیس حسین علی! ایسے نہیں جاؤں گا۔ اگر میری جاں بخشی کی ہے تو یہ یقین بھی دلاؤ کہ سدوری کے بال کا بھی نام نہیں لو گے۔ اسے اک حرف ملامت بھی نا کہو گے۔" جانب علی شاہ ہنوز اس کو اوٹ میں لیے۔ مضبوطی سے بولا۔ سدوری کی سسکی اس کے محبت بھرے وجود سے ٹکرا کر دکھ کی دراڑیں ڈالنے لگی۔

"دیکھ پیر! دیکھ تجھے چھوڑ رہے ہیں یہ کافی ہے۔" بخش علی نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔ "اب یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ ہماری مرضی ہم جانیں' چھوری کو چھوڑیں یا ماریں۔ تمہارا کچھ نہیں جاتا۔ آرام سے جان بچا کر بھاگ جا۔" بخش علی چلایا۔

"پھر بخش علی مارنا ہے تو دونوں کو مار۔ میں بھی جانب علی شاہ ہوں۔ سائیں محی الدین کا بیٹا۔ سدوری کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ یا تو میرا اس سے نکاح کراؤ۔ یا اس کی بھی جاں بخشی کرو یا پھر ہم دونوں کو ایک سی سزا دو' قتل کرو یا مارو' تین میں سے ایک شرط منظور کرو۔ جانب علی شاہ تب ہی جائے گا۔"

اس کا ٹھہرا ہوا دھیما لہجہ سب کو کھلا رہا تھا۔ عورتوں نے دوپٹوں کے کونے دانتوں تلے دبا کر سدوری کی خوش نصیبی کو دل ہی دل میں سراہا۔ ولی محمد رو پڑا۔ سدوری کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔ پتا نہیں رونا دکھ سے تھا یا خوشی سے۔

بخش علی کا طیش کسی طور کم نہ ہوتا تھا۔ مگر وہ بھی فوری طور پر گولی چلانے کی جرأت نہ کر سکا۔

"ایک تو تمہاری جان بخشی کرتے ہیں دوسرا شرطیں باندھتے ہو۔" اس نے جانب علی کے سینے پر دھتکارنے والے انداز میں ہاتھ مارا۔

"ہٹ جاؤ بخش علی۔ مرشد کے بیٹے پر ہاتھ نہیں اٹھاؤ۔" حسین علی نے بیٹے کو دھکا دے کر دور کیا۔ "جیسے تو یہاں سے محفوظ جا رہا ہے۔ ویسے ہی سدوری بھی محفوظ رہے گی۔ مگر اک وعدہ کر پھر ادھر نہیں آئے گا۔"

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ کبھی اس سے ملنے تمہارے گھر نہیں آؤں گا۔" وہ وعدے کی صلیب پر لٹک گیا۔ درد کی میخیں اپنے وجود میں گڑتے محسوس کیں۔ مگر سدوری کی زندگی کے لیے یہ زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ سدوری کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔

وہ اسے جیتے جی مار رہا تھا۔ "ہاں جاؤ ہم اپنے وعدے پر عمل کریں گے۔ تم بھی اپنے وعدے پر قائم رہنا۔" رئیس حسین علی نے سر ہلاتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

"ابا! یہ غلط ہے۔" بخش علی بے بسی سے بولا۔

"چپ کر بخش علی! ابھی میں زندہ ہوں۔ فیصلے کرنے والا تو کون ہوتا ہے۔" اس نے پہلی بار بیٹے کو زور سے جھڑکا۔

اس نے اک الوداعی نگاہ سدوری پر ڈالی۔

اس سے سدوری کا دل زمین میں گڑ جانے کو چاہا۔ "یہ کیا۔۔۔ کیا سائیں! یہ کیا کیا' زندہ درگور کر دیا۔" اس کے لب شکار کیے پرندے کی طرح پھڑپھڑائے۔

"جانب علی شاہ! دیکھ تجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ تو چل کر رات کے اندھیرے میں اس رئیسانی سے ملنے جاتا ہے۔ بیٹا! انسان کو بدنام کرنہ خود کو۔"

سائیں محی الدین کے الفاظ اس کی سماعتوں میں گونجنے لگے۔

"پیر سائیں! آپ نے ہمیشہ مجھے وعدوں سے باندھا ہے۔ ورنہ رئیسانی کو اٹھا کر نکاح کرنا کون سا مشکل کام تھا۔" وہ ہجر رو تا واپسی کے راستے پر پیدل گامزن تھا۔

☆ ☆ ☆

انسان کتنا مجبور ہوتا ہے' چاہنے کے باوجود بھی کچھ نہیں کر سکتا' سالوں تک ایک ہی راہ پر سر جھکائے۔ کندھے لٹکائے' تھکے ماندے وجود کو گھسیٹتا بے بسی سے چلتا جاتا ہے۔ زندگی یوں ہی کٹ جاتی ہے۔ انیس سال تک وہ اسی محبت' فرقت' ہجر درد کے راستے پر چلتا رہا تھا۔

"اگر وہ میرے نصیب میں ہوتی تو ضرور مل جاتی یہ رسمیں رواج تو نرا بہانہ ہیں۔ بات تو ساری مقدر کی ہے۔"

اس دن ملنے کے لیے آنے والے ولی محمد سے اس نے بے بسی سے کہا۔

"آپ کو پیر سائیں بلا رہے ہیں۔" فقیر خادم حسین کے کہنے پر وہ دونوں اٹھ کر اندر آ گئے۔

سائیں محی الدین کو دو دن سے بخار تھا۔ وہ حجرے میں چاشت پڑھ کر لیٹے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم بابا سائیں!" اس نے جھک کر ان کے ہاتھ کی پشت کا بوسہ لیا۔ اس کے لبوں پر حرارت کا لمس چپک گیا۔

"بابا سائیں! آپ کو بخار ہے۔ اگر اجازت دیں تو ہم آپ کو شہر کے کسی اچھے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرا دیں۔"

پیر سائیں نے شفقت سے نگاہ بیٹے پر ڈالی۔

"ابا جانب علی! میرا طبیب وہ ہے۔" شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔ "شفا اس کے حکم کی محتاج ہے اور ہم اس کے حکم کے منتظر۔"

توں حبیب توں طبیب توں درد بھی دوا
(تو حبیب تو ہی طبیب تو ہی دردوں کی دوا بھی)

ان کے لب متبسم رہے۔ جانب علی کی نگاہ ان کے چہرے پر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

اپنے شانوں سے کھیس نما چادر اتار کر بیٹے کو اوڑھائی۔

"اللہ تجھے اپنی بارگاہ میں سرخرو رکھے بیٹا!"

جانب علی شاہ خود کو سنبھالنے لگا۔ وہ رونا نہیں چاہتا تھا' مگر ضبط پر بندھے بند ٹوٹ گئے۔

"آج کون سی تاریخ ہے بابا!" انہوں نے بیٹے کی پیشانی کا بوسہ لے کر پوچھا۔

"پیر سائیں انتیس۔" فقیر خادم حسین نے فوراً جواب دیا۔

"کاری رات کجو گھڑو او نہ اوندای
(کالی رات ہے میرا گھڑا کچا ہے)
انیس کا اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔"

"بابا!" انہوں نے جانب علی شاہ کو دیکھا۔

انہوں نے امر الٰہی کہہ کر آسمان کی طرف شہادت کی انگلی اٹھائی۔ "ورنہ کون اس گڑھے میں اپنی مرضی سے گیا ہے۔ کون جاتا ہے۔" پیر سائیں نے زمین کی طرف انگلی الٹی کر کے اشارہ کیا۔ جانب علی کے ساتھ ولی محمد' خادم حسین کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں۔

والے اپنے حجرے میں بچھے مصلے پر لیٹ گئے۔ جانب علی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب زمین پر بٹھایا۔ وہ چند لمحے رکے۔ موندی آنکھیں کھول کر بیٹے کو دیکھا۔

"بارگاہ الٰہی میں تیرے لیے دعا گو ہوں کہ خدا تجھے کندن بنا دے۔ تو میرے حجرے کی رونق ہے۔ جانب علی بابا! میرا حجرہ تجھ سے آباد ہو گا۔" پیر سائیں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ آنکھیں موند لیں۔ بلند آواز سے کلمہ پڑھا۔

اور جانب علی شاہ حجرے سے حجرے میں آ گیا۔

ہر طرف موت کی اداسی پھیل گئی۔ آسمان پر ابر امڈ آیا' سائیں محی الدین کے گاؤں میں عقیدت مندوں' دوستوں' جاننے والوں کا ہجوم اکٹھے ہونے لگا۔

رئیس حسین علی جنازے پر آیا۔ دھاڑیں مار مار کے رویا اور سائیں محی الدین کی عظمت ایسی اس کے دل میں بیٹھی کہ ان کی وفات کو دل پہ لے لیا۔

"پیر سائیں کتنے عظیم تھے۔ میرے سامنے جھولی نہیں پھیلائی۔ اپنے اکلوتے جوان بیٹے کی مجبوری قبول کر لی۔ پر میرا مان نہ توڑا۔"

یہ دکھ اسے کھا گیا۔ ٹھیک اس دن جب پیر سائیں کا چالیسواں تھا اور جانب علی نے پگ (دستار) باندھی' رئیس حسین علی نے سفر آخرت اختیار کیا۔ وصیت کے مطابق سے پیر سائیں کے قدموں کی طرف دفن کیا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

جانب علی شاہ کے دربار میں بھی مجلس درس میں عشاق کا میلہ لگا ہوا تھا۔ وہ محو ہو کر اس کا درس سن رہے تھے۔

عشق تلاش ہے۔
عشق جستجو ہے۔
عشق تجسس ہے۔
جب عشق کا متلاشی عشق کی حیرتوں سے باہر نکلا اس سے گم ہو گیا۔"

جانب علی پر ہزاروں نظروں کا ارتکاز تھا۔

"عشق فنا کا معاملہ ہے۔ وجود کی فنا' خودی کی فنا' انا کی فنا' اپنی رضا کی فنا۔"

"میں" غیرت کی جڑ ہے۔
"ہم" دوئی کا نشان ہے۔
"تو" حاصل مقصود ہے۔

عشق کی حد کسی ایک انسان پر ختم نہیں ہوتی' یہ بے حد ہوتا ہے۔ محبت کو صرف وجود ظاہری وفانی تک محدود کرنا نامرادی ہے اور نامردی بھی۔

ہر مراد سے آگے انسان کی ایک آخری مراد ہونا چاہیے جو بعد از فنا بقا کی طرف لے جائے۔

ظاہر سے باطن کا سفر ہی بقا کا راستہ ہے۔

اس "ایک" کے سوا کوئی بھی چیز ہمیشہ نہیں' قائم نہیں۔

وہ جیسا ہے' ویسا ہی رہے گا۔ ہمیشگی اسی کی ذات کا حصہ ہے۔"

جانب علی شاہ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ اس کا دل ٹھہر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس دن شدت سے وہ یاد آئی کہ اس کے روئیں روئیں سے پکار اٹھتی تھی۔ دل ہر قیمت پر آج پھر اسے دیکھنے کو تڑپنے ہمکنے لگا۔

اس نے گھبرا کر وضو کیا۔ مصلے پر آ گیا۔ مغرب پڑھ چکا تھا۔ خیال یار سے فرار حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔

وہ نوافل پر نوافل ادا کرتا رہا' مگر اسے حضوری حاصل نہ ہو پا رہی تھی' دل کو چین نہ ملتا تھا۔ حتیٰ کہ عشاء کا وقت ہو گیا' اس کا خاص خادم' خادم حسین اسے امامت کے لیے لینے آیا۔

وہی غائب دماغی اوڑھے وہ مسجد میں آ گیا' اس نے سوچا' آج وہ امامت کے قابل نہیں' اس کے دل سے وہ نکل نہیں رہی تھی۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آیا' اس نے مصلے پر خادم حسین کو کھڑا کر دیا۔

"سائیں! آپ کے ہوتے میں کیسے پیش امامی کر سکتا ہوں۔" مگر اس کی بند آنکھیں نیم وا ہو گئیں۔ نفی میں ہلتا سر' خادم حسین کے لیے حکم عدولی ممکن نہ رہی۔ اس نے نماز پڑھی لیکن دھیان یکسو نہ تھا' بار بار دل بھٹک جاتا۔ نماز کے بعد وہ نفل پڑھتا رہا۔

مگر ہر طرف وہی تھی دروازے سے آتی ہوئی' کبھی کھڑکیوں سے' کبھی چھت کے فانوس سے نکلتی' کبھی مصلے کے کونے سے' کبھی منبر پر بیٹھتی' کبھی دیوار پر لگے گھڑیال سے جھانکتی' وہ گھبرا کر صحن مسجد میں آیا' وہاں بھی ہر نمازی کے چہرے پر اس کا چہرہ چڑھا ہوا تھا۔ گملوں کی طرف' وضو خانے کی طرف' ساری مسجد سدوری بن گئی'

ہر جگہ اس کے وجود کا راج تھا' حسن کی روشنی تھی۔ وہ گم ہونے لگا اس روشنی میں کور چشم بن گیا۔ سوائے سدوری کے اس کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔

"الٰہی! کیوں اس بندے کو دھتکار رہے ہو۔" کھلے آسماں کی طرف بے بسی سے التجائیہ نظر کی' اسے قرار نہ تھا۔ بار بار شکوہ کناں نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا' بے دھیانی میں عادت کے مطابق چپل پہن کر باہر نکل آیا' وہ اسی کچی پگڈنڈی پر چلتا جاتا تھا۔

مسلسل نماز میں کھڑے ہونے سے اس کے پاؤں پہلے ہی درد سے شل تھے۔ اب چلنے سے اور دکھنے لگے' وہ ستاروں کی چھاؤں میں پیہم چلتا ہوا شرمندہ سر جھکائے نظریں زمین پہ گاڑے اسی راہ پر چلتا تھا۔ جس راہ پر بائیس سال سے چل رہا تھا۔

آج کی رات وہ دامن میں بائیس سالوں کی محبت اٹھائے جاتا تھا۔ پورے وجود میں فراق' دکھ' بے بسی' بے قراری بھر گئی تھی۔ بائیس سال کی کیفیات وجود میں جمع ہو گئی تھیں' کیفیات سے پر وجود' بے خودی سے گھسیٹا جاتا تھا۔

گاؤں پہنچ کر اس کے قدموں پر تھکن نے سر نچا' دھیرے دھیرے چلتا ہوا' باہر سوئے' ولی محمد کی چارپائی کے سرہانے آکھڑا ہوا' چارپائی کے ہلنے پر ولی محمد سمجھا' کوئی چور بھینسیں چوری کرنے آیا ہے' سرعت سے اٹھ کر پستول نکال کر تان لیا۔

اس سے اس کے دل نے شدت سے خواہش کی' ولی محمد ٹریگر دبا دے۔ گولی مار دے۔

ولی محمد کوئی حرکت نہ پا کر دیکھنے کو قریب آیا' کھلی ہوئی چاندنی میں اپنے دوست کو بخوبی پہچان گیا۔

"سائیں!" ولی محمد کی آواز خوف' حیرت' صدمے سے کانپی' پستول فوراً پھینک دیا' اس کے قدموں میں بیٹھ گیا' پیر پکڑ لیے۔

وہ ہاتھ جوڑتا۔ ٹانگوں سے لپٹتا' روتا جاتا' اسے یاد آگیا تھا سائیں آدھی رات کو کیوں آتا تھا' گزرے سالوں میں ولی محمد تو جیسے یہ بات ہی بھول گیا کہ وہ سائیں کا آدھی رات کا پیغامبر' پہریدار' سدوری کا چچا زاد ہے۔ ولی محمد نے اپنے اوپر اوڑھنے والی رلی کو ٹھیک کر کے چارپائی کے بستر پر بچھایا۔

خاموشی اوڑھے' چپ سادھے سائیں کو' ادب سے ہاتھ سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھایا' آہستہ آہستہ لمبے ڈگ بھرتا ان کا پیغام سنبھالتا گھر کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ وجود جس نے اس کو سالوں سے خود کا نہیں رہنے دیا تھا' چلا آیا تھا پورے تین سال بعد اس کی صورت دیکھ کر وہ پریشان ہو اٹھا' وہ آکر اس کے پائنتی پر بیٹھ گئی۔

بیٹھتے ہی اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔

وہ یک ٹک' چودھویں کے چاند کی روشنی میں' اس کے مرجھائے' کملائے ہوئے وجود کو استعجاب و دکھ سے دیکھتا رہا۔

اس کی شفاف تالاب جیسی آنکھیں جو رات کو بھی چمکتی تھیں' پیلی پڑ کر زرد ٹھہرے ہوئے گدلے پانی کی طرح ہو گئی تھیں۔ اسے یرقان ہو گیا تھا۔ اسے پتہ چلا تھا تو حکیمی دوائیں تیار کر کے' اس کو بھجوائی تھیں۔ ولی محمد نے بتایا تھا کہ اب وہ ٹھیک ہے۔ مگر اس کی صورت بتا رہی تھی۔ وہ ٹھیک نہیں رہی اور اس کے بغیر ٹھیک رہ بھی کیسے سکتی تھی۔

"سا... سائیں... ! کیسے ہو سائیں؟" وہ ہانپنے لگی۔

"بڑی دیر سے یاد کیا نمانی... کو..."

آگے وہ بول نہ پائی۔ کھانسی کا دوسرا دورہ پڑا' کھانستے کھانستے اس نے خون اگلا' دوپٹے میں آگیا۔

"ٹی بی نے تمہاری جان نہیں چھوڑی؟" اس نے بول کر کہا' حالانکہ یہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا' وہ اسے اپنی بے تابی بتانا چاہتا تھا۔ مگر یہ بات کر بیٹھا۔

"ہاں... سائیں! روگ کی طرح ہی لگ گئی ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے بات ٹکڑوں میں مکمل کی۔

اسے سدوری کی آواز کی خوب صورتی یاد آئی جب بولتی تو وہ مسحور ہو جاتا۔ ارد گرد اس کی باتوں کی مہک پھیل جاتی۔ وہ سارا خوشبو خوشبو ہو جاتا۔ اس کے وجود پر تغیر وقت نے اپنا بھرپور اثر ڈالا تھا اور وہ یوسف نہیں تھا۔ جو اس کو جوانی ہانگ گردان کر دیتا۔

اس کے نرم و ملائم گداز خوب صورت ہاتھ' جن کو اگر کبھی بے اختیاری سے اس نے تھاما تو دنوں اس کے لمس و گداز سے مسحور رہتا' اس وقت ہمدردی سے اس کے ہاتھ تھامے تو لگا جیسے ڈھانچے کے ہاتھوں کو پکڑ لیا ہو' اس کے ہاتھ کی ہڈیوں کو نرم ہاتھوں سے سہلانے لگا۔

اس کے ہونٹوں نے گلابیوں کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ پپڑی

زدہ ہونٹ سیاہی مائل ہو گئے۔ پورا وجود ڈھانچہ بن گیا۔

ولی محمد سائیں کے لیے دودھ لے کر آیا۔ ٹارچ جلا کر اس نے گلاس سائیں کو پیش کر دیا۔ اس ٹارچ کی روشنی میں سائیں نے اس کے خزاں رسیدہ وجود کو عجیب دکھ سے دیکھا۔ ہجر اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر گیا تھا۔ بیماریاں اس کے وجود کو ایسے چاٹ گئیں کہ وہ اپنی اصلی صورت ہی کھو بیٹھی۔

اس نے چند گھونٹ بھرے اور ہمیشہ کی طرح گلاس اسے تھمایا۔ وہ آہستہ آہستہ سائیں کا جھوٹا دودھ پیتی رہی۔ سائیں نے سر جھکا لیا' اس کے سر کے بالوں میں' داڑھی میں' کنپٹیوں پر سفیدی اگ آئی تھی۔

"مرنے سے پہلے آپ کو اک بار دیکھنے کی تمنا تھی۔ سو آج پوری ہوئی۔" وہ بات پوری کر کے ایک دم ہانپنے لگی۔

اس نے اک بار پھر حیرت سے ٹکٹکی باندھی۔

اس کا گنوایا حسن' اس کا رنگ و روپ' لبوں کی گلابیاں' تازگیاں' رخساروں کی سرخیاں' آنکھوں میں تجسس کی حیرانیاں اور شاید دل بھی سب فنا کی طرف گامزن۔

"سائیں! آپ نے اس غریب پر بڑی نوازش کی کہ اپنے مبارک قدم ادھر لا کر' اس بانسوں بندی کی بندی کو دیدار کی سعادت نصیب کی۔" وہ آب دیدہ ہو گئی۔

توں ممنوں آویں گندری' منواں میں عیب ہزار
ہی مستی مسی بکبار' مستاں ماں کر مناسیں

(تو حاکم و بادشاہ میں پھیرن بدبودار مجھ میں ہزاروں عیب و خامیاں ہیں مگر مجھ ملاح زادی کی بو دیکھ کر مجھے نظر انداز نہ کر دینا' ٹھکرا نہ دینا۔)

سدوری نے شاہ سائیں کے سرنوری جام تماچی کا بیت حسب حال دھیمے لہجے میں رقت سے پڑھا۔

چاند اپنے پورے جوبن پر تھا۔ عین ان کے اوپر' اس کائنات میں ہر چیز اپنے عروج پر آنے کے بعد زوال پذیر ہوتی ہے اور اب وہ بھی اس قانون فطرت کی زد پر تھے۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کا جوبن ڈھل گیا۔ یہ جوبن انہوں نے ایک دوسرے کو صرف دیکھتے ہی بتا دیا۔

"حاصل؟"

اک بہت بڑا سوالیہ نشان' ان کی جاتی ہوئی جوانی نے آتی ہوئی جدائی کی پیشانی پر چھوڑ دیا تھا' اسے لگا کہ اس کے دل پر قرار اترنے لگا ہے' بھید کھلنے لگے ہیں۔ وہ اسرار جن کے پیچھے وہ بائیس سال سے دوڑتا رہا ہے' وہ اسرار اب پھر چہرے سے نقاب اٹھانے لگا ہے اور اپنا آپ دکھانے پر راضی ہے۔

ولی محمد نے سوچا تھا کہ سائیں' سدوری کو بھول گیا ہے مگر سائیں اسے بھولا نہیں تھا' اور وہ پہرہ دینے میں مستعد تھا۔ کسی حد تک خوف زدہ سا بھی کہ کہیں کوئی آ نہ جائے۔ وہ کسی سائے کا گمان کر کے ٹارچ جلاتا پھر مطمئن ہو کے بیٹھ جاتا۔

"سوچا تمہاری طبیعت پوچھ آؤں۔ کافی دن ہو گئے۔ کوئی خیر خبر ہی نہ ملی۔" اب کی بار بھی وہ یہ نہیں کہنا چاہتا تھا مگر کہہ بیٹھا' وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ تمہاری یاد نے مجھے اتنا بے قرار کیا کہ میں مسجد کے مصلے سے بھاگ آیا ہوں۔ اس کی زبان یہ اقرار کرنے کی جرات نہ کر سکی۔

"سائیں! بڑی مہربانی آپ کی مجھ مسکین پر۔" وہ خوشی سے کہہ کر مسکرائی۔

اسی وقت ولی محمد نے اطمینان کے لیے ٹارچ جلائی' اس روشنی میں اس نے واضح دیکھا کہ اس کے مسکرانے سے اس کی آنکھوں' ہونٹوں کے کونوں پر جھریاں پڑنے لگیں اور اس کی پیشانی پر لمبی جدائی نے جھریوں کی صورت اپنا اثر چھوڑا تھا۔ وہ اتنی بوڑھی تو نہیں تھی۔ مگر بیماریوں نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔

"سائیں... ! مجھ نمانی کی اک آخری خواہش ہے۔ حسرت ہے' طلب ہے۔ وہ ضرور پوری کرنا۔" اس نے سائیں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

جانب علی شاہ نے اسے دیکھا۔ بہت توجہ سے' محبت سے۔

"سائیں! مجھے کاندھا دینے ضرور آنا۔ میرا جنازہ آپ پڑھانا اور میرے ساتھ میری قبر تک رخصت کرنے کو چلنا۔" وہ آب دیدہ ہو کر روہانسی بولی۔

اس نے رکی ہوئی سانس چاندنی کے حوالے کی۔

"سائیں! بائیس سال آپ نے اس نمانی کو اپنے راستے پر چلایا ہے۔ بس آخری بار میرے راستے پر آنا۔ مجھے مٹی تلے چھوڑ جانا۔"

کون کس کو کس کے راستے پر چلاتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا' وہ بائیس سال تک اس کے راستے پر چلتا آیا تھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ اس کو اپنے راستے پر چلاتا آیا ہے۔ اس نے سوچ سے پر سانس لی۔ اس کے مرنے کی باتیں سن کر

بھی اس کا دل بے قرار نہیں ہوا تھا' ورنہ یہ تصور ہی اس کے لیے محال' جان لیوا تھا۔

"سائیں! میری قبر کے سرہانے دعا مانگنا۔ سائیں! میرے سائیں آخری بار اپنی میٹھی آواز کا رس میرے کانوں میں ڈالنا۔" وہ رو پڑی۔

اس نے اپنے آگے ہاتھ جوڑے اس کے التجائیہ ہاتھوں کو پکڑ کر اپنے لمس سے دلاسا دیا۔

"تو فکر نہ کر میں ضرور آؤں گا سدوری!"

وہ اس کے دلاسے پر نجانے کیوں زیادہ رونے لگی۔ شاید اس کی آواز آخری بار سننے کا غم تھا اسے یا بچھڑنے کا۔

سدوری نے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کیا اور چپ ہو گئی۔

کتنی ہی دیر دونوں سماعتیں کسی لفظ سے آشنا نہ ہو سکیں۔ خاموشی کے ان لمحات میں وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ وہ چارپائی پر پیر اوپر کر کے گھٹنوں کے گرد اپنے بازو باندھے لپیٹے' اس کے سامنے بیٹھا رہا۔ اس کے پیروں پر اس کا ہاتھ سرسرانے لگا۔

"سائیں! ہم نصیب سے ہار گئے۔" گلا رندھ گیا۔

جانب علی نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے سائیں کے پاؤں پکڑ لیے۔ یہ نرم و گداز مٹی سے اٹے گرد آلود پاؤں اس کے لیے میلوں تک کا سفر کر کے آئے تھے۔

وہ آب دیدہ ہو گئی۔

کتنی خوش قسمت تھی کہ ایسی چاہت اس کا مقدر بنی۔

جانب علی شاہ نے اپنے پاؤں سے اس کے ہاتھ نہیں ہٹائے تھے۔

"ڈرتی تھی کہ آپ کو دیکھنے کی آس لیے ہی نہ مر جاؤں' میٹھے مہربان رب کا لاکھوں شکر کہ میری یہ آرزو پوری کر دی۔"

اطمینان اس کے وجود سے جھانکنے لگا۔ وہ اب سر جھکائے بیٹھے بیٹھے تھکنے سی لگی تھی۔ تپ دق' یرقان اور دمے نے اس کو ختم کر دیا تھا۔ مگر در حقیقت ہجر نے اسے گھلا دیا۔

رات اپنے آخری سانس لے رہی تھی۔

سحر نمودار ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی۔

وہ خالی الذہنی سے اسے اونگھتے دیکھنے لگا۔

وہ ختم ہو رہی تھی۔ دلنا بہ دن فنا کی قربت کے قریب تر'

اس کی نگاہیں اونگھتے وجود پر جم گئیں۔

ہر چیز پر تغیر ہے' ہر چیز فنا ہے۔ ہر چیز زائل ہو جاتی ہے۔ ہر چیز کا خاتمہ ہے۔

اس کا ذہن سوچ کی خوشبو سے معطر ہو گیا۔ وہ اونگھ رہی ہے۔ اس کا محبوب اس کے پاس بیٹھا ہے۔ بہت دور سے پیدل چل کر آیا ہے۔ اللہ کے گھر سے بھاگ آیا ہے۔ نماز سے منہ موڑ آیا ہے۔

اور یہ اونگھ رہی ہے۔

نماز کی ہر رکعت قیام رکوع سجدہ' قعدہ میں اس کو یاد کر کے آیا ہے۔

اور وہ فنا وجود قربت محبوب کے باوجود نیند سے ہار مان رہا ہے۔ وہ فنا وجود سانس لے رہا ہے۔

یہ سانس اس کے وجود کا حصہ ہے۔ مگر عجب ہے کہ یہ سانس اس کی اپنی نہیں۔ اسے مستعار دی گئی ہے۔ امانتاً دی گئی ہے۔ اس کا محبوب پاس تھا مگر وہ بوجھل نیند سے غافل تھی۔

اس کے ذہن میں روشنیوں کے جھماکے ہوتے جا رہے تھے۔ اسرار بے نقاب ہوتے گئے۔ بھید کھلنے لگے۔

محبوب سے غفلت' محبت کی موت ہے۔

محبوب سے قربت کے باوجود دوری' وفا کا قرینہ نہیں' اسے نیند کے جھٹکے آ رہے تھے۔ وہ آنکھیں کھولتی پھر بند ہو جاتیں۔ وہ پھر سے اونگھنے لگ جاتی۔

"اسے اونگھ نہیں آتی۔ اسے نیند نہیں آتی۔"

"اسے اونگھ نہیں آتی۔"

اور وہ اونگھ رہی تھی۔ باوجود قربت محبوب کے' اور اگر کوئی اس کے قریب جائے تو وہ غافل نہیں ہوتا۔

حق کی مہک اس کے چاروں اطراف من کے اندر باہر پھیلنے لگی۔

مرغوں نے اذانیں دینا شروع کیں۔ وہ نیچے اتر آیا۔ چپل پہنی جس طرح آیا تھا۔ اسی بے خودی کے ساتھ واپسی کے لیے پلٹ آیا۔

"اسے اونگھ نہیں آتی۔ وہ فنا سے پاک ہے۔ تغیر سے ماوریٰ ہے۔

وہ جیسا تھا۔ ویسا ہے۔ ویسا ہی رہے گا۔" اس کے قدم تیزی سے اٹھتے رہے۔ کچی پگڈنڈی پر بھاگتا جا رہا تھا۔

وہ شروع رات میں بقا سے بھاگا تھا اور اب پچھلے پہر میں فنا سے بھاگ رہا تھا۔

اس نے رات کی شروعات سے اختتام تک بائیس سال کا اڑا اگے (مشکل ترین) عشق کا سفر طے کیا تھا۔ اس نے نگاہ آسمان کی طرف نہ اٹھائی۔

وہ شرمندہ شرمندہ دوڑتا نظریں نیچی کیے روتا جاتا تھا۔

اس کی کیفیت بڑی عجیب ہو گئی۔

وہ بائیس سال سے کس کے پیچھے دوڑتا آیا تھا۔ اس کا حسن ختم ہوا' جوانی ختم ہوئی اور صحت ماند پڑ گئی۔ بائیس سال سے اک بوتے (بت) کو پوجتا رہا۔ دل کو مندر بنا کر اسے دیوی بنا دیا۔ وہ رونے لگا۔ اس کا ہر اک موئے تن گریہ و خوف سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے خلاف تن گیا۔

محبوب سے غفلت مرگ محبت ہے۔

اور محبوب حقیقی سے غفلت' مرگ عبادت بھی ہے۔

فجر کا وقت ہو گیا۔ وہ روتے بلکتے راستے میں مسافروں کے لیے بنائی گئی چھوٹی سی مسجد میں داخل ہو گیا۔

کونے میں پڑے ہوئے مٹکے سے پانی نکال کر وضو کیا' محراب میں کھڑا ہو گیا۔ مصلے پر شرم سے گر گیا۔

"اللہ اکبر!" نیت باندھنے کے ساتھ ہی سارے بل اکڑ گئے۔ سردی کا موسم نہ ہونے کے باوجود اسے ہلکی ہلکی سردی محسوس ہونے لگی۔ جیسے سارے جسم پر برف کا چورا رکھا ہوا ہے۔

"ساری تربیتیں ہی کے لیے تھیں۔ ہیں اور رہیں گی وہ اتنا مہربان ہے کہ محبت کے ننانوے حصے اپنی ذات کے لیے رکھے اور اک دنیا میں بھیج دیا اور روز قیامت وہ اپنی بائیس سالہ محبت و زندگی کی مشقت کے لیے جواب دہ ہو گا۔" اس کا گریہ بڑھ گیا۔

بس چاہا چیخ چیخ کر نماز میں رونا شروع کر دے' سوچ تلاوت کے مفہوم میں گم ہوتی رہی۔ بائیس سال تک اک مٹی کے پتلے کو مانگا' چاہا' جو سانس بھی اس کی دی ہوئی لے رہا تھا۔ ادھار کی سانس جو کہ اسے واپس کرنی ہی تھی۔

یہ سیدھا راستہ نہیں تھا۔ وہ بھٹکا ہوا اب سیدھا راستہ مانگ رہا تھا۔ وہ پہلی بار تابعداری سے عظیم و اعلا رب کے آگے جھکا تھا۔

اس کی نماز ختم ہو گئی۔ اب وہ سجدے میں استغفار کر رہا تھا۔ اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔

"یا اللہ! تو جانتا ہے اس سے محبت میں نے جان بوجھ کر نہیں کی' الٰہی! اس سے محبت میں نے سوچ سمجھ کر نہیں کی' اچانک ہی ہو گئی۔ پتہ نہیں کس طرح ہو گئی۔ میں مجبور ہو گیا۔ اس کے راستے پر چلنے لگا۔

کہاں جاتا' کیسے بھاگتا۔ یہ تو تو نے میرا مقدر کر دی تھی۔ تو ایسا نہ چاہتا تو میں کبھی اس کی طرف مائل نہ ہوتا۔" اس کی گریہ نما آواز بلند تر ہو گئی۔

وہ با آواز بلند رب سے باتیں کرنے لگا۔ حال دل بتانے لگا۔ اپنی بے بسی لاچاری' عاجزی سے بیان کرتا رہا۔

"اللہ' یا اللہ' اللہ سائیں۔۔۔" وہ بلند آواز سے پکارتا پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"تو نے مجھے عقل دے کر خواہش کا پابند کر دیا۔

اور پھر آزمائش میں ڈال دیا کہ اس خواہش کی پابندی سے نکل کر میری طرف آؤ۔ میرے پاس آؤ۔" وہ بچوں کی مانند کبھی انکار کبھی اثبات میں سر ہلاتا۔ وہ سب کچھ اسے بتا دینا چاہتا تھا۔ سوچتا تارہا۔

"میں خود نہیں چلا میں خود نہیں چلا۔" اثبات میں سر ہلایا۔

مگر۔۔۔ مگر مجھ سے اک غلطی ہوئی ہے کہ میں عارضی کو مستقل سمجھتا رہا۔

تو نے تو محبت کے ذریعے میری تربیت کی اور میں اسی تربیت کو ہی اصل سمجھ بیٹھا۔

تو نے مجھے عقل دے کر عالم ناسوت میں خواہش کا پابند کر کے آزمائش میں ڈالا اور میں فانی خواہش میں پھنس گیا۔ مقید ہو گیا اس کو حرف آخر سمجھ بیٹھا۔

اے مالک سائیں! میں ناقص ہوں' تو کامل ہے۔ میں جاہل ہوں تو عالم' بے خبر ہوں تو خبیر میں گناہ گار تو ستار میں بدکار تو غفار اگر تو عدل کرتا تو میں اس دنیا میں اور ذلیل و خوار ہو جاتا۔

مگر تو نے فضل فرمایا۔ میرے ساتھ تو نے توفیق دی کہ میں تیری طرف پلٹوں۔ تیری جانب آؤں۔ میں تو ناکام ہوں آزمائش میں۔"

وہ رو تا بلند آواز میں کہتا رہا۔

☼ ☼ ☼

سدوری کی بیماری آخری اسٹیج پر پہنچ گئی۔

سول ہسپتال کے بیڈ کے سرہانے ولی محمد کھڑا اس کو تکتا رہا۔

وہ گلابی سدوری زردیوں میں گھری ہوئی تھی۔

"او ولی محمد!" بمشکل نام لے کر وہ ہانپ گئی۔ ولی محمد

ایک دم سے جھکا "ہاں ہاں اَدی! کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟" اس نے زردی گھلی ہوئی آنکھیں ولی محمد پر گاڑ دیں۔

اس کی آنکھوں سے آنسو نکلا اور کنپٹی میں غائب ہو گیا۔

ولی محمد دکھ و تاسف سے زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"اوا۔۔۔" ولی محمد نے اس کے لب کھلنے کے انداز سے اس کی پکار کو پہچانا۔

"اَدی۔۔۔ اَدی! جی اَدی!" وہ سرعت سے اپنا کان اس کے منہ کے قریب لے آیا۔

"م۔۔۔ میری۔۔۔ اطلاع۔"

ولی محمد اس کے ٹوٹے لفظوں سے سمجھ گیا۔ "پہنچا دوں گا' پہنچا دوں گا۔" اثبات میں سر ہلاتے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"م۔۔۔ میرا۔۔۔ ج۔۔۔ جنازہ۔۔۔" اس نے ہچکی بھرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں' کہہ دوں گا' کہہ دوں گا۔ اَدی! بے فکر رہو۔" اس نے سدوری کی مردہ ہوتی آنکھوں میں دلاسے کا دیا جلایا۔ اک لمحے کو اس کی مرتی ادڑھے آنکھوں میں دیے کی سی لو چمکی۔

وہ سخت تکلیف میں بول نہ سکنے کے باوجود بولنے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جاتی تھی۔ چوتھا دن تھا' اسے ہاسپٹل میں' ولی محمد میلے پر گیا ہوا تھا۔ رات کو گاؤں پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ سدوری سخت بیمار ہے۔ صبح وہ چائے پی کر گھر سے نکلا' سیدھا شہر آیا تھا' اس کو دیکھنے۔ اب وہ اس کے سرہانے کھڑا' اس کا حال دریافت کر رہا تھا۔

"اَدی! تو ٹھیک تو ہے نا بھلا؟" وہ اس پر جھکا بار بار پوچھتا۔

"ٹھیک تو اب۔۔۔ اب موت ہی کرے گی۔" وہ بے وقت سانس لیتے گویا ہوئی۔ وہ دکھی ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ جو اس سے کہتی تھی۔ "اوا ولی محمد! جانب سائیں کے وچھوڑے نے جیتے جی مار دیا۔" وہ اب واقعی مر رہی تھی۔

اس نے اجرک کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ "کیا کیا نہ کیا' اَدی سدوری نے۔ سائیں کی نظر پڑی تو اوروں کی نظریں خود پر حرام کروا لیں۔ ایک ہی چار دیواری میں بیٹھ گئی۔ باہر نکلنا' زمینوں پر آنا جانا۔ چارہ کاٹنا سب موقوف کر کے خود کو محفوظ کر لیا۔ صرف سائیں کے لیے۔"

ولی محمد اور سدوری ایک ہی واڑے میں رہتے۔ ساتھ ساتھ گھر ان کے جو گزرتے وقت کے ساتھ کچے سے پکے گھروں میں تبدیل ہو گئے۔ وہ اپنے دو بھائیوں بخش علی اور علی محمد کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کا گیٹ ایک ہی تھا۔ کبھی جو ولی محمد گیٹ کے اندر داخل ہوتا' اسے گیٹ کے قریب بیری یا ببول کے درخت کی چھاؤں میں بجز صمینتا' گنگناتی تو بے ساختہ بھٹائی کی طرح پوچھ بیٹھتا۔

جو مڑیاں سو چار و' سو آہے کجاڑو

(جو سب سے اچھا اور بہتر ہے' وہ کیا ہے بھلا؟)

وہ دھیمے سے مسکراتی اور شہید عبدالرحیم گرھوڑی کی طرح ایک دم بول اٹھتی۔

"هکڑی صحت سریجی' بیو ریس جو پاڑو۔"

(اک صحت جان کی' دوسرا محبوب کا پڑوس)

اس وقت اس کے لوں لوں سے جانب علی شاہ کی محبت پھوٹ پڑتی اور آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہو جاتیں۔

ولی محمد مسکراتا' سر ہلاتا' اس کی نم آنکھوں پر کڑھتا آگے بڑھ جاتا۔

"ڈاکٹر کہتا ہے۔ یہاں علاج نہیں ہے۔ اَدی کو اب کراچی لے جانا پڑے گا۔" بخش علی کمرے میں داخل ہوتے بولا۔ "تو بتا ولی محمد! اب کیا کریں؟" اس نے آنکھیں کھول دیں۔ انکار میں سر ہلانے لگی۔ ولی محمد' بخش علی کی تائید کرتے کرتے رک گیا۔

"پیسوں کا انتظام ہے؟" ولی محمد نے بات بدلنے کو پوچھا۔

"وہ تو ایک دو دن میں علی محمد کر کے بھیج دے گا۔"

"اَدی! تمہیں لے چلیں کراچی؟" ولی محمد نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ اوا۔۔۔! نہیں مجھے واپس۔۔۔ گھر لے چلو۔" اس نے پوری توانائی یکجا کر کے بمشکل جواب دیا۔

"اوا بخش علی! میرا خیال ہے کہ ابھی ایک دو دن یہیں رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ولی محمد! تم گاؤں واپس جاؤ گے۔" بخش علی نے تھکاوٹ سے چور لہجے میں پوچھا۔

"اوا! آج میں یہیں ہوں۔ آپ جاؤ۔ تھک گئے ہو۔ جا کر آرام کرو۔"

"نہیں ولی محمد! میں بھی یہیں ہوں۔ گھر جا کر کیا کروں گا۔ بیٹھا پریشان ہوتا رہوں گا ادھر۔"

ولی محمد نے اس کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا۔

"سائیں کو کیسے اطلاع دوں؟" وہ بیٹھا سوچتا رہا۔

سدوری پر اب غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ وہ دوا کے زیر اثر سو گئی۔ ولی محمد کو وہیں بیٹھے بیٹھے رات پڑ گئی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بار بار چائے منگوا کر پیتا رہا۔

اسے یقین تھا کہ اَدی سدوری کو بیماریوں نے نہیں۔ ہجر و فراق نے چاٹ لیا تھا۔ اس کے باپ اور بھائیوں کی ضد نے اسے تباہ کر دیا تھا۔

پیر سائیں اور رئیس حسین علی کی وفات کے بعد خادم حسین' جانب علی شاہ کا پیغام لے کر پہلی بار بخش علی کے پاس آیا۔ بخش علی سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"سائیں کے بعد اب جانب علی شاہ ہمارے ساتھ زبردستی کرے گا۔ طاقت کے بل بوتے پر' دیکھو خادم حسین! میں سدوری کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا گوارا کر لوں گا' پر اس کا رشتہ پیر سائیں کے بیٹے کو نہیں دوں گا۔"

ولی محمد اور خادم حسین کے بے تحاشا سمجھانے کے بعد بھی وہ نہیں مانا۔

"سائیں جانب علی! وہ نہیں مانتا' بابا سائیں بروچانے (لوہے) ضد ہے۔ جس بات پر اڑ جائیں' اس سے ہٹتے نہیں' اس نے رتی بھر لچک نہیں دکھائی۔"

"بس بابا! وہ ہمارے نصیب میں نہیں۔" سائیں نے دوسری بار پھر پیغام نہیں بھیجا۔

وہ آنکھیں موندے بیڈ کے قریب پڑے اسٹول پر بیٹھا رہا۔ اس کی نظروں کے سامنے سدوری اور سائیں جانب علی شاہ کی محبت کی فلم چلنے لگی۔ وہ اپنے کچے آنگن میں جھاڑو لگاتی اور چپکے چپکے گاتی جاتی تھی۔

آیا آنگن عجیب نصیب بھلا۔

اوبے۔ آنگن چماں یا عجیب چماں۔

(آئے آنگن میں محبوب' نصیب اچھے ہو گئے۔ یہ آنگن چوموں یا محبوب کو۔)

وہ خوش و مسرت سے گنگناتی۔ پلو سے آنکھوں کی نمی پونچھتی۔

ولی محمد جب بھی نگار علی سلیم کا گایا یہ کلام سنتا اسے سدوری کی بودھی سی آواز' نم آنکھیں' متبسم لب یاد آتے۔

ولی محمد بیٹھے بیٹھے سوچتے سوچتے تھک گیا۔

بخش علی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کو کچھ دیر بعد اٹھانے کی تاکید کر کے بینچ پر سو گیا۔

رات کے ایک بجے بخش علی نے اس کو شانے سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"ولی محمد! مجھے اَدی کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

اس نے بخش علی کے پریشان چہرے کو دیکھا پھر بیڈ کی طرف۔ "تم سچ کہہ رہے ہو اوا بخش۔ اَدی کی سانس اکھڑ رہی ہے۔"

وہ دوڑ کر ڈاکٹر کو لے آیا۔

ڈاکٹر نے فوراً" آکسیجن لگائی۔ ولی محمد بیڈ کے دوسرے کنارے اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"اَدی وے پتہ کن حالوں میں ہو۔" ولی محمد اسے ہچکیوں کو چار و دیتے دیکھ کر پوچھتا۔

"ہجن اَھین ساتھ کنیس اناس ہو مرے۔"

(ہجن اور دھرتی کوئی بے ضمیر بے وفا ہی بھولے)

وہ آہ بھر کے کہتی۔ وہ دل کہ جس کی ہر اک دھڑکن میں محبت دھڑک رہی تھی۔ وہ دل ساکت و ساکن ہونے کے لیے اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔

ولی محمد پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

اس نے اس کی بند آنکھوں کو دیکھا جو بالکل سیاہ حلقوں میں بدل گئی تھیں۔

بابا ہجر تو کالا ناگ ہے' جہاں ڈستا ہے سیاہ داغ چھوڑ جاتا ہے۔

کالے کمیس میں لپٹا جانب علی شاہ اپنے حجرے سے بولتا اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔

اسی وقت سدوری نے آنکھیں کھولیں اور آخری ہچکی لی۔

ولی محمد نے روتے ہوئے رسٹ واچ پر نظر کی' دونوں کانٹے تین کے ہندسے پر تھے۔ اس کی کھلی مردہ آنکھوں سے اس نے اک پیغام وصول کیا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

وہ پریشان ہو کر نیند سے جاگا تھا۔

اس نے کوئی خواب دیکھا تھا مگر اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کیا دیکھا ہے۔ اس نے اٹھ کر لائٹ آن کی' بہت تیز تیز دھڑکنے والے دل کو سنبھالنے کی جستجو کرنے لگا۔ اس کی نظر بے اختیار وال کلاک پر پڑی دونوں کانٹے تین کے ہندسے پر تھے۔

محبت کے بے شمار لمحوں میں وہ ان گنت تجربات سے

مختلف کیفیات و احساسات سے گزر چکا تھا۔ مگر آج کی کیفیت اس کے لیے بالکل نئی اور حیران کن تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

وہ سر جھکا کر کتنی ہی دیر خاموشی سے آنکھیں موند کر بیٹھا رہا۔ یہ کیا ہو رہا ہے 'میرے ساتھ' اس سوچ نے اس کے اندر تلاطم بھر دی تھی۔ وہ خالی الذہنی سے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

"میری ذات کے اندر یہ زلزلہ کیوں آیا؟"

اک حیران کن سوچ کی لہر پوری طاقت سے اس کے ذہن سے ٹکرائی۔

اس سے پہلے بھی اس کی ذات کے اندر کئی زلزلے اٹھے تھے۔

اس دن جب وہ اس پری جانی کی زلفوں کا اسیر ہوا۔ اس رات جب پیر سائیں نے اس کے مقدر میں نہ ہونے کی قیامت خیز خبر سنائی تھی۔ اس رات بھی جب اس سے ملاقات کرتے پکڑا گیا۔ ان پر بندوق تان لی گئی تھی۔

اس رات جب اس سے آخری بار ملاقات کر کے لوٹا تھا۔

اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ وہ مرد تھا۔ مرد روتے نہیں۔ مگر ناکام محبت کی کسک مردوں کو بھی رلاتی ہے۔

اس دشت کی سیاحی میں اس کا وجود جھلس گیا تھا۔ لوگ کہتے وہ کندن بن گیا۔ مگر وہ خود کو دیکھتا تو لگتا! خاک ہوا چاہتا ہے وہ سالوں تک۔ عشق کی جنوں خیزیوں میں شب بیدار رہا۔

اس شب بیداری نے اسے خدا کے قریب کر دیا۔ وہ اپنے دکھ اپنی باتیں اپنے اللہ سائیں سے کہنے لگا۔

تہجد کا وقت ہونے پر بصد سکون و خاموشی سے تہجد پڑھی پھر گھٹنے کھڑے کر کے ان پر بازو لپیٹ کر آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔

"یا اللہ! تو نے مجھے تیئس سال اس وجود کے پیچھے دوڑایا۔ مگر صرف دوڑایا۔ میرے حصے میں سفر لکھا' منزل نہیں اللہ سائیں! تو نے اس کی محبت میرا مقدر کی مگر اس کو میرا مقدر نہیں بنایا۔

اے میرے مالک! تو باقی ہے۔ تیری رضا بھی باقی ہے۔ میں فانی' میری رضا بھی فانی۔ میں اپنی فانی رضا کو باقی رضا پر قربان کرتا ہوں۔ میرے مالک سائیں! میں راضی ہوں۔ میں راضی ہوں اور مجھے اپنی رضا پہ راضی رہنے کی ہمیشہ توفیق دیے رکھنا۔" وہ اس دعا کی تکرار کرنے لگا۔

اذان فجر سن کے باہر نکل آیا۔ مسجد میں ادائیگی نماز کے بعد معمول کے وظائف پڑھتا رہا' اشراق کی نماز کے بعد فقیر خادم حسین اس کا ناشتہ لے آیا۔

وہ ناشتا کر ہی رہا تھا کہ ولی محمد کے آنے کی اطلاع دی گئی۔

"سائیں!" ولی محمد ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا ولی محمد! خیریت ہے؟" دھڑکتے دل کے ساتھ افسردہ ولی محمد کا بغور جائزہ لے کر استفسار کیا۔

ولی محمد روتے ہوئے انکار میں سر ہلانے لگا۔

"سائیں بابا! وہ 'وہ نمانی اب نہیں رہی۔ گزر گئی۔"

بمشکل ہچکیوں میں بات مکمل کر پایا اور جانب علی شاہ کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا۔ اس کا دل زور زور سے کانپنے لگا۔

"سائیں! میں سیدھا ہسپتال سے یہاں آیا ہوں بابا! اس نمانی کا آخری پیغام۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولا۔ "سائیں! آپ کو لینے آیا ہوں آخری ملاقات کروانے کے لیے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جانب علی شاہ کی آنکھوں سے بے آواز خاموش آنسو نکل کر اس کی داڑھی میں جذب ہونے لگے۔

رات اس کی ذات کے اندر ہی زلزلہ اٹھا تھا کہ وہ ہجر گزیدہ اب اس جہان بے ثبات کے ہاتھ سے بے مراد زندگی کا پیچھا چھڑا کر نئے سفر پر گامزن ہونے جا رہی تھی۔

اس کی تیئس سالہ محبت کا انجام یہی تھا۔

غم رگوں میں گردش کرتا رہا۔

دل کی جگہ سینے پر ہاتھ رکھا۔ دل کے بین اس کی سماعتوں سے ٹکراتے رہے۔

تیئس سال کی تھکان نے اس کے وجود کو شل کر دیا۔ دل اس کو نڈھال کیے رہتا تھا۔ زندگی کی حرارت جیسے رگ رگ سے نچڑنے لگی ہو۔

ولی محمد سائیں کا دل اجڑنے پر سسکتا رہا۔

"میں ضرور چلوں گا ولی محمد ضرور۔ اپنے وعدے سے نامرد پھرتے ہیں' مرد کی شان ہی وعدہ وفائی ہے۔" وہ آب دیدہ ہوا۔

فقیر خادم حسین یک دم پریشان ہو اٹھا۔

"سائیں! ایسا نہ ہو کہ بخش علی والے کوئی گند کر بیٹھیں۔ آپ کی گستاخی ہم سے برداشت نہیں ہو گی۔"

"بابا خادم حسین! آج کا دن یہ باتیں سوچنے کا نہیں۔ بابا! آج تو ہم آخری بار اس راستے پر جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے لوٹ آئیں گے۔ بابا! بس آخری بار۔"

وہ باوجود ضبط کے رو پڑا۔

"سائیں! پہلے مجھے بھیجیے میں حالات کا جائزہ لے کر آؤں پھر آپ چلیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔" خادم حسین نے روتے روتے اس کے پاؤں پکڑ کر اس کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

"بابا! وہ آخری بار بلا رہی ہے مجھے۔ آج میرے راستے میں پہاڑ بھی کھڑے کر دو گے۔ تو میں وہ بھی ریزہ ریزہ کر کے جاؤں گا۔"

"سائیں! پھر ہمیں اجازت دیں۔ فقراء پہرے دار اور ہتھیار بند لے چلیں تاکہ وہ لوگ کچھ کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں۔"

"نہیں بابا! نہیں' ہم نے تو کبھی زندگی میں اس سے ملنے کے لیے ہتھیار بندوں کا سہارا نہیں لیا۔ اس کی موت پر کیا لیں گے۔ دل کا مالک کوئی ایک ہی بنتا ہے اور بابا جو دل کا مالک ہو قدم خود بخود اس راہ پر چلنے لگتے ہیں۔"

"سائیں! وہ کچھ نہیں کریں گے بابا! مری مٹی پر کیا جھگڑا!" ولی محمد نے آب دیدہ ہو کے کہا۔ "بابا خادم حسین! اٹھو میری خاندانی نشانیاں لے آ' آج جانب علی شاہ پوری شان سے جائے گا۔"

"حاضر بابا سائیں حاضر۔" وہ سرعت سے آنسو پونچھ کر سوٹ کیس لے آیا۔

اس نے بڑے سائیں سے ملا کئی نسلوں کا خرقہ خلافت پہنا۔

اپنی خاندانی دستار باندھی۔

پیر سائیں کی ذاتی چادر کاندھوں پر ڈالی۔

خادم حسین اک اک چیز اسے تھماتا رہا۔

"خادم حسین! نجفی کی تسبیح دو۔"

"حاضر سائیں!" کہتے خادم حسین نے دونوں ہاتھوں میں تسبیح رکھ کر مؤدبانہ ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ جانب علی شاہ نے تسبیح اٹھا کر لبوں پر رکھ کر چوم لی۔

یہ اس کی نجفی کی نشانی تھی۔ ہمیشہ مشکل و کڑے وقت میں یہی تسبیح اٹھا کر ذکر کرتا۔ اس پر نجفی کی تیس سالہ

جنازے کا دولہا بالکل تیار تھا۔ دلہن کو آخری سفر پر روانہ کرنے جا رہا تھا۔ ولی محمد، خادم حسین اس کو دولہا بنے دیکھ کر روتے رہے۔

جانب علی شاہ نے ہاتھ سے پکڑ کر ولی محمد کو اٹھایا۔ اوطاق کے صحن میں آگئے۔ خادم حسین نے فوراً "گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

وہ آنکھیں موندے "یاحی یاقیوم" کا ورد کرتا رہا۔ گاڑی رکی، آنکھیں کھولی تو سامنے سے جنازہ آرہا تھا۔

"شکر ہے سائیں! ہم وقت پر پہنچ گئے۔" ولی محمد کہتے ہوئے اترا فرنٹ ڈور کھولا۔

بخش علی اسے گاڑی سے اترتے دیکھ کر ٹھٹکا۔

بہت سارے لوگ آگے بڑھ بڑھ کے جانب علی شاہ سے ملنے لگے۔

اس کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بخش علی کو بھی آگے بڑھنا پڑا۔ جھک کر مصافحہ کیا۔

جانب علی شاہ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ کی ہلکی سی تھپکی دی۔ "بابا بخش علی! جو اللہ کی مرضی۔"

"ہاں سائیں! جو رب چاہے، وہی کرے۔"

اس نے آگے بڑھ کر جنازے کو کاندھا دیا۔ زندگی بھر یہ خیال بھول بھٹک کر بھی اس کی سوچ میں نہ آیا کہ اک ایسا بھی وقت آئے گا، جس کو دلہن بنانا چاہتا ہے۔ اس کو کاندھا دینے آئے گا۔ وہ رخصتی تو کر رہا تھا۔ مگر کسی اور طریقے سے، اس کی آنکھوں میں نمی کروٹیں لینے لگی مگر وہ کمال ضبط سے خود کو سنبھال گیا لا الہ الا اللہ کے ذکر کے ساتھ چند قدم چلنے کے بعد جنازہ رکھ دیا گیا۔

وہ نماز جنازہ کے لیے آگے کھڑا ہوا۔ پیچھے لوگ صفیں باندھ رہے تھے۔

بظاہر اس کی نظریں جنازے پر تھیں۔ مگر در حقیقت تیئیس سالہ محبت کے کئی مناظر، اس کی آنکھوں تلے کروٹیں لینے لگے۔ کئی سرگوشیاں اس کی سماعت میں دم لینے لگیں، جب جب وہ اس سے ملنے آتی۔

"سائیں۔۔! میں تو آپ کے "ہاتھ ونجنڑی" (ہاتھ کا پنکھا) کی طرح ہوں، جدھر چاہو گھماؤ جھلاؤ۔۔۔"

"سائیں۔۔! آپ کا دیدار میری حیاتی کی ضمانت ہے۔"

"سائیں۔۔! من مانتا نہیں، آپ سے دور ہونے کو۔۔"

۔۔۔ نے کیا جبر کا وار کیا تھا اس پر، وہ بانسوں باندھ کی بانہیں۔ کفن میں بندھی پڑی تھی۔

جانب علی شاہ کا رواں رواں غم سے کھڑا ہو گیا۔

اس نے نیت باندھ کر تکبیر کہی اور پہلی ہی تکبیر کے ساتھ خیال کا الہامی پرندہ اس کے دل کے بیچ آبیٹھا۔

انت الباقی۔۔۔ انت الباقی۔۔۔

یہ بولی یہ آواز اس کے رگ و پے میں گونجنے لگی۔

"تو ہی باقی ہے۔ مالک تو ہی باقی ہے۔"

ثنا پڑھ کر دوسری تکبیر لگائی۔

(ہر چیز "ماسوا اللہ" کے فنا ہونے والی ہے۔)

جنازہ سامنے تھا۔ جس بت کو اس نے تیئیس سال پوجا وہ بت آج ٹوٹ گیا۔ فنا ہو گیا، وہ درود پڑھنے لگا اور یہ سائیں کا حجرے میں پل پل کے وجد سے با آواز بلند۔

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

بار بار، جھوم جھوم کے۔ سرشاری سے پڑھتا وجود اس کی بصارت میں آسمایا۔ تیسری تکبیر لگائی تو بیبی کی نصیحت یاد پڑ آگئی۔

"بیٹا! صبر وہ ہے جو شروع صدمے میں کیا جائے۔"

اس کے دل پر ان دیکھی دعاؤں کی برکت سے صبر نازل ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا دل قرار پکڑنے لگا۔ وہ دعا مانگنے لگا۔

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ جو مارتا اور زندہ کرتا ہے۔ یا اللہ! حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر اور آپ کی آل پر درود بھیج۔۔۔

یا اللہ! تو نے اس کو پیدا کیا، رزق دیا، تو نے ہی اسے موت دی، اور تو ہی اس کو زندہ کرے گا۔۔۔ تو اس کے رازوں کو جانتا ہے، ہم تیرے پاس اس کے سفارشی بن کے آئے ہیں۔ ہماری سفارش قبول فرما۔۔۔ یا اللہ! اسے قبر کے فتنے اور جہنم کے عذاب سے محفوظ فرما۔۔۔ یا اللہ! یہ تیرے پاس مہمان ہے اور تو بہترین میزبان ہے، یہ تیری رحمت کی محتاج ہے اور تو اس کو عذاب دینے سے بے نیاز ہے۔۔۔

یا اللہ! سوال کے وقت اس کی زبان کو قائم رکھنا، اسے قبر میں طاقت سے زیادہ مبتلا نہ کرنا۔ یا اللہ! ہمیں اس کے ثواب سے محروم نہ کرنا اور اس کے بعد ہمیں فتنے میں مبتلا نہ کرنا۔" وہ اس کے سامنے قبر میں اتاری جا رہی تھی۔

وہ بے بسی و لاچاری سے اپنی ان آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا، جن میں اس کو دلہن بنے دیکھنے کے خواب سجائے تھے یہ کیسی تعبیر تقدیر نے دامن زندگی میں ڈالی تھی۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ میں تھامی عصا کے سہارے کھڑا تھا۔ اجرک و چادر اترنے کے بعد سفید کفن میں لپٹے مٹی وجود کو دیکھتا رہا۔

پہلی نظر سے آخری نظر تک بہت کڑا کٹھن سفر طے کیا۔ آج اس سفر کے بعد منزل پر کھڑا اس کو آخری منزل پر وداع کرنے آیا تھا۔ اس محبت نے کیا کیا روپ رچائے۔ کیا کیا ڈھنگ دکھائے "انت الباقی" دل الہامی پرندے کی آواز سے گونجتا تھا۔ انت الباقی۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے سے زیر لب دہرانے لگا۔ انت الباقی۔۔۔ تو ہی باقی ہے مولا۔ تو ہی باقی رہے گا۔"

آنکھوں کے سیاہ حلقوں والا زرد چہرہ۔ اب مٹی سے ڈھکنے لگا۔ اس نے عصا فقیر خادم حسین کو تھمایا! مٹی ہاتھوں کی اوک میں بھر کے۔ اس کی قبر پر ڈالی۔

(اس زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا۔) دوسری بار مٹی ڈالتے پڑھا۔

(اسی میں تم کو لوٹا کر لائیں گے) تیسری بار ہاتھوں میں مٹی بھری۔

"آخری اور اسی سے روز قیامت تم کو دوبارہ نکال کر کھڑا کریں گے۔"

وہ کانپتے لرزتے ہاتھوں سے مٹی ڈال کر اٹھا الوداع تا قیامت الوداع۔

"یاحی یاقیوم" کی قوت سے کھڑا ہو گیا۔ "سب فنا ہے۔ یہ سارا عالم فنا ہے۔ بس تو ہی باقی، قائم زندہ ہے مولا تھا اور ہمیشہ رہے گا۔"

اس نے آخری دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ سب نے حلقہ باندھ کر دعا مانگی۔

سارا ماحول سوگوار تھا۔ سائیں نے دعا کے بعد قبرستان سے خدا حافظ کہا۔ بخش علی نے اسے گاؤں چلنے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔

وہ "یاحی یاقیوم" کا ورد کرتا گاڑی میں آبیٹھا۔

سدوری کو منزل مل گئی، اس کی منزل ابھی دور تھی۔

وہ راضی ہو رہا تھا۔ اس رضا پہ، جس کو فنا نہیں، توفیق الٰہی اس کے دل پر سایہ فگن ہو چکی۔ وہ لوٹ رہا تھا۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس راستے سے جس راستے کا حسن، انتہا ابتدا صرف فنا تھی۔

اب جانب علی شاہ اس راہ پر گامزن ہونے جا رہا تھا۔ جو راہ کامیابی، قبولیت اور برگزیدہ بندوں کی راہ تھی۔

وہ اس سنت پر چلنے جا رہا تھا۔ جس پہ چل کے خدا کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ وہ عشق الٰہی کی معطر فضا میں سانس لینے لگا۔ یہ عشق کا سفر، نکتے سے کائنات کا سفر، قطرے سے سمندر، تن سے من، جسم سے روح کا سفر تھا، یہ صرف سفر تھا، منزل نہیں، "اس سفر کی ساری راہیں" اس کی طرف جاتی تھیں، جس نے اپنے "امر" کی روشنی اجسام میں روح بنا کر پھونک دی۔

"اے میرے مالک!

از عمل خویش ندارم امید

بر کرم تست مرا اعتماد

"مجھے اپنے اعمال سے کوئی توقع و امید نجات نہیں ہے۔ میں تو صرف تیرے کرم پر اعتماد و بھروسا رکھتا ہوں۔"

کائنات متحرک ہے، دنیا نے ابھی چلنا ہے اور ہر پیدا ہونے والا بچہ عالم ناسوت میں ثمر امید ہے۔ کہ خدا اس فسادفی الارض "انسان" سے ہنوز مایوس نہیں۔

اس حویلی کا سونا پن فنا ہوا اور اک نومولود کی چیخوں نے اجاڑ و ویران و خاموش و سنسان حویلی میں تہلکہ مچا دیا۔

بی بی سکینہ نے جو کہ ماموں زاد تھی۔ جانب علی شاہ کی اس حویلی کے سکوت کو توڑ کے چہکاریں پھیلا دی تھیں۔

جب محبت گزیدہ جانب علی شاہ کو اپنے محبین کے آگے بدلیل، حدیث یار ماننا پڑی۔

"حضور! اب شادی کرلیں یہ سنت بھی ہے اور سائیں محی الدین کی خواہش بھی تھی۔"

"اس عمر میں؟" جانب علی شاہ نے استعجاب سے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں سرکار! آپ کے اجداد میں شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی نے پچاس سال کی عمر میں نکاح اولیں کیا۔ اور سلام بحری کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ ہمارے مذہب میں رہبانیت نہیں ہے۔"

جانب علی شاہ نے دست بستہ ایستادہ خادم حسین مع فقراء و محبان کو نظر خرد سے جانچا۔ پرکھا اور حقانیت اسلام کے آگے سر تسلیم خم کر لیا تھا اور آج نئی زندگی کا جنم حویلی کے اندر خوشی کی کرن بن کر آیا تھا۔

☆